Jan - FEB. 1950 (مطابق مارچ ۱۹۵۰) Regd. L. No. 908.

رسالہ اشاعت اسلام

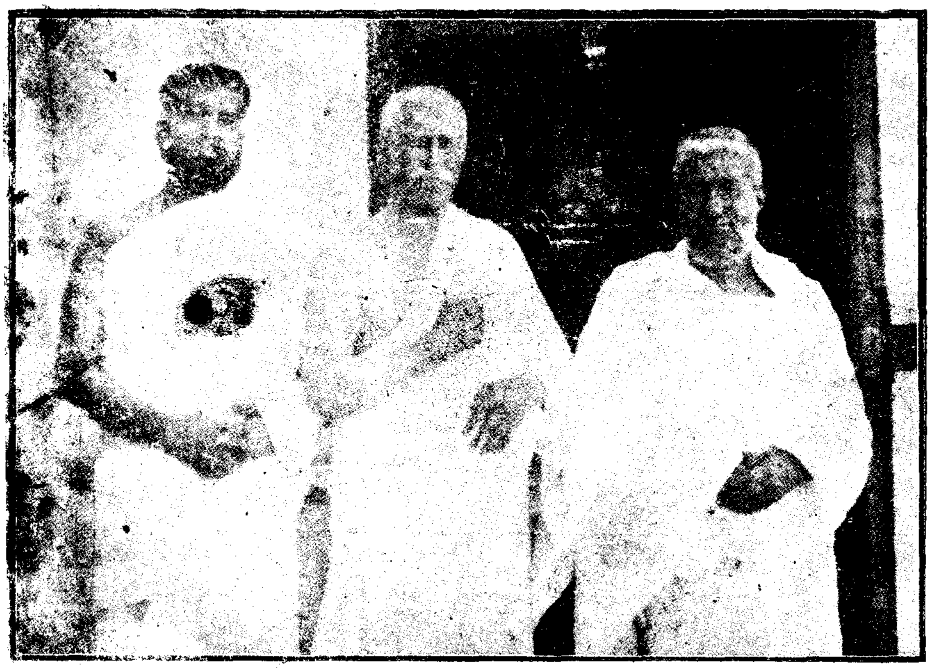

"حضرت خواجہ کمال الدین اور لارڈ ہیڈلے حالت احرام میں۔"

www.alahmadiyya.org

حضرت خواجہ کمال الدین اُف ووکنگ

جنوری فروری ۱۹۵۰ء

اشاعت اسلام

جلد ۳۶ شمارہ ۱، ۲

زادِ راہ

لمعات ۲
مقالات — سینٹ کمال آف ووکنگ ۴
مملکت پاکستان کی اسلامی اساس ۸
اسلامی تہذیب کا تصوّر ۱۲
ایمان بالغیب - حریّت کی بُنیاد ۲۲
ہندوستان میں اسلام کا مستقبل ۲۵
رُجحانات ۳۱
گھریلو زندگی کا مسئلہ ۳۵
شاعرِ مشرق ۳۹
مغرب کی آواز ۵۰
جدلی مادیت کا تاریخی پس منظر ۵۹
اسلام کا نظریۂ شعر ۶۹
منظومات — مساوات ۔ صابر ایوب ۷۴
نومسلمہ ۔ ط-ن-ی-ل ۷۵
...... پوچھتا ہوں ۔ اعظم علوی ۷۶
انسان ۔ پرولتاری ۷۷
تنقید و تبصرہ — کتابیں اور رسائل ۷۸

ایڈیٹر
غلام ربّانی (بی۔ اے۔ آنرز)

فی کاپی ۸ ر
سالانہ چندہ - پانچ روپے (پاکستانی)

گیلانی پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام خواجہ عبدالغنی پرنٹر پبلشر چھپ کر عزیز منزل برانڈرتھ روڈ لاہور سے شائع ہوا۔

لمعات

آج ہم اپنی جد و جہد کی چھتیسویں منزل میں داخل ہوتے ہیں۔ مجلّۂ اشاعتِ اسلام ایک خاص مقصد اور ایک خاص طریقِ کار کا ترجمان رہا ہے۔ اس کا کام محض مسائل سلجھانا نہیں بلکہ ایمان محکم کے ساتھ علم کے مشعلبرداروں کو اسلام کے برحق اور قابلِ عمل دین ہونے کی دعوت دینا ہے۔ اس کے پس منظر میں عالمِ اسلام کی ایک تبلیغی دعوت کے سوتے ہیں جو مغرب سے اسلام کا سورج طلوع ہونے پر ایک اندھا نہیں بلکہ حق الیقین رکھتی ہے۔ ان پینتیس سال میں خطۂ زمین کے ہر انقلاب نے ہمارے موقف اور تجزیہ کی تائید کی ہے اور یہ بالکل عیاں نظر آتا ہے کہ یہ تبدیلیاں خود خالق کائنات کے ایک طے شدہ منصوبہ کے تحت عمل میں لائی جا رہی ہیں۔ کل ہم مرض کی تشخیص میں منفرد تھے اور یہ خدا تعالیٰ کا احسان ہے اور آج ہمارے ہمنوا لاکھوں کی تعداد میں ہیں۔ لیکن آج ہم دوا کے تجویز کرنے میں منفرد ہیں گو لاکھوں اس دوا پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ اسے دور کی کوڑی لانا کہتے ہیں۔ لیکن الحمد للہ کہ ہم اپنے موقف اور مقصد پر مضبوطی سے قائم ہیں۔

لیکن مبلغ پر بہت بڑی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ مبلغ جس ماحول میں ہوتا ہے لئے ان کا پورا پورا خیال ہوتا ہے جس امر کی طرف لوگوں کو بلایا جاتا ہے اس کے متعلق سب اشتباہ و اشکال دور کرتے ہوتے ہیں لیکن مسائل اور الجھن کو حل کرنے کا ڈھنگ مناظرانہ اور محاربانہ نہیں بلکہ سائل کی گنجلک کو اچھی طرح سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ اکثر اوقات مبلغ کو سائل کا سوال سمجھنے کے لئے خود کو سائل کی حیثیت میں رکھنا پڑتا ہے جب کہیں ہمدردی، محبت اور انسانی شرف کے احترام کو برقرار رکھتے ہوئے مسئلہ کو سمجھایا جا سکتا ہے۔ مبلغ چھوٹے چھوٹے جذبات اور عصبیتوں کی رَو میں نہیں بہتا کیونکہ اس کا خدا اور معبود زمین و آسمان کا خالق اور مالکِ کل ہے۔ اور اسی کی تخلیق یہ تمام نسل انسانی ہے۔ مبلغ کے لئے کفر کے متعلق جہاں دُکھ اور غم موجود ہوتا ہے، وہاں کفّار کے لئے ایک بے پناہ ہمدردی اور رحمت بھی ہوتی ہے کیونکہ گنہگار اور کج رَو خود دُکھ میں سسک رہے ہوتے ہیں۔ ان کے دُکھ کو محسوس نہ کرنا انسانیت سے عاری ہونا ہے۔ یہی مبلغ کی حِس ہے جو اُسے کامران و کامگار کرتی ہے اُسے مشرق و مغرب، سفید و سیاہ سے بلند ہو کر توحیدِ الٰہی اور توحیدِ انسانیت کی دعوت دینا ہوتی ہے۔ اسی لئے اسے اپنے مخاطبین کے رسم و رواج، علمِ الٰہیات، طرزِ کلام، لوک گیت اور دیو مالا کا پورا پورا علم ہونا چاہیئے۔ پھر اس کی اپیل محض جذبات نہیں ہوتی نہ محض منطق بلکہ وحی الٰہی سے مترتب وجدان سے وہ نمو پاتی ہے۔ حالات و ماحول کو چھانتی ہے اور اس کا طرزِ تخاطب معزز اور رحم انگیز ہوتا ہے۔

اشاعت اسلام اُردو بولنے اور سمجھنے والے قارئین تک اس پیغام کا پہنچانا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ برِ کوچک ہندوپاکستان کے اُردو حلقے اس کے اصلی مخاطب ہیں اشاعت اسلام کے لئے ان عوام کے تقاضے اور مطالبات، حقوق اور فرائض، دُکھ اور آسائش کا سمجھنا اور انہیں کسی ایک راہ کے قبول اور کسی دوسری راہ کے استرداد کا مشورہ دینا ضروری ہے۔ کیونکہ وہ صرف اور صرف ایک مقصد کو لیکر چلا تھا اور وہ بلّغ ما اُنزل الیک تھا۔ وہ جس دعوت کا نگہبان اور جس پیغام کا نقیب ہے اس میں اسے اس کا پورا پورا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اس کی یہ دعوت کہاں کہاں ماحول سے ٹکراتی ہے۔ کون سا پہلو سازگار نہیں اور کس پہلو کو اسلامی ماحول میں ویسا ہی رکھا جا سکتا ہے جیسا کہ وہ اس وقت کفر کی شاہی میں ہے۔

اس مقصد کے حصول کے لئے ہمیں اپنے مخاطبین سے دو باتیں کہنی ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ مصنفین اور ادیب جو اسلام ہی کو اپنی زندگی کا نصب العین منتخب کر چکے ہیں اور جن کے نزدیک اسی میں موجودہ عالمی دُکھ اور مصیبت کا دوا موجود ہے انہیں اپنی کوششوں کو پھر سے مربوط کرنا چاہیئے۔ منازل کی دُوری سے کم ہمت نہیں ہونا چاہیئے۔ زندگی جینے کا نام ہے اور اگر حرکت نہیں تو پھر زندگی بے معنی ہے۔ دوسری بات ہمارے اُن احباب سے متعلق ہے جنہوں نے زندگی کے مسائل کو سنجیدہ طریق پر سوچا ہے اور اس گتھی کو حل نہیں کر سکے۔ سلامتی کا پیغام ان کے لئے مشتبہ ہو گیا ہے۔ وہ اپنے اس اشتباہ اور شک کو صاف صاف جانچیں۔ ہمیں اپنے دُکھ کا بخوبی اندازہ کر کے صحیح مرہم تلاش کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ماہنامہ اشاعتِ اسلام اُن کے اشتباہ و اشکال کے سلجھاؤ میں اُن کی ہر ممکن مدد کرے گا۔

وہ خدا جو رحمدل اور شفیق ہے ہمیں اپنے کام کو زیادہ احسن طریق پر بجالانے کی توفیق دے۔ اور دُکھی انسانیت اس بے پناہ بحران و مصیبت سے نجات پائے۔ اے خدا ایسا ہی کر۔

ان الدین عند اللہ الاسلام ومن یبتغ
غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو فی الاخرۃ
من الخسرین

زندگی کی راہ تو خدا کے نزدیک صرف اسلام ہے
اور جو کوئی اس کے سوا کسی اور راہ کو پسند کرے گا
ہرگز نہ پہنچ پائے گا
اور آخرکار ناکام رہے گا۔

"سینٹ کمال آف وکنگ"

آج سے ٹھیک اٹھارہ برس پہلے کی بات ہے کہ لاہور میں اس انسان نے وفات پائی جس کا عمل موجودہ دور کے مسلمان مفکرین کے لئے حیرت اور استعجاب تھا ——— یہ حضرت خواجہ کمال الدین تھے۔

عیسائی کلیسا کی ابتدائی تاریخ میں چند بہت بڑے انسان موجود ہیں جن کی انتھک کوششوں اور قربانیوں اور ایمان نے ملحد رومن ایمپائر کی بنیادیں اکھیڑ دی تھیں۔ دنیا کی وجاہت اور ظاہری شان و شکوہ سے بے نیاز ہو کر ان لوگوں نے زمین کی پیٹھ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا۔ صبح و شام صرف ایک مقصد کو سامنے رکھا کہ خدا کے بندے صرف خدا کے آگے جھک جائیں۔ تاریخ انہیں اصحاب کہف اور قرآن انہیں عیسیٰ علیہ السلام کے حواری کہتا ہے۔ یہ لوگ ایک مقصد کی منادی کے لئے نکلے تھے۔

اسی طرح اسلام کے منادی ہیں۔ برعظیم ہند و پاکستان میں ایسے کئی لوگ محو خواب ہیں جنہوں نے تن تنہا دشوار گذار سفر اختیار کئے اور لوگوں کو خدا پرستی اور انسانی آزادی کا درس دیا۔ علی ہجویریؒ، معین الدین چشتیؒ، اور حضرت مجدد الف ثانیؒ اس شاہ راہ کے راہی تھے۔

انیسویں صدی عیسوی میں جب مسلمانوں کے ہاتھ سے سلطنتیں جانی شروع ہوئیں اور یکے بعد دیگرے کئی ممالک سے ان کی بالا دستی ختم ہو گئی تو اسلام کے متعلق ایک عام یاس اور نا امیدی چھا گئی۔ مغربی علم و فن کی برتری و فوقیت نے جہاں ظاہری طور پر ہوا کا رخ بدل دیا وہاں ذہنی طور پر اپنے مخاطبوں کو اس قدر مرعوب کیا کہ مغربی علماء و حکیموں کے سامنے کلام کرنے کا تصور ہی ایک پاگل پن اور بے ہودگی سمجھا جانے لگا۔ عام طور پر ایک معافی طلب APOLOGETIC انداز تحریر پیدا ہوا۔ انیسویں صدی کا مسلم علم و ادب، صحافت و تقریر، اسی قسم کے انداز سے بھرا پڑا ہے۔
شبلی نے صاف صاف کہا:-

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشان کیسا
چراغ کشتۂ محفل سے اٹھیگا دھواں کب تک
قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیئے پرزے
فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک

مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک

اس تشکک کے دور میں ۱۸۷۰ء کو پنجاب کے ایک شہر میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام والدین نے کمال الدین رکھا۔ کمال الدین نے اپنے ابتدائی ایام اور درس و تدریس کا دور شہر کے مقامی اسکول میں طے کیا۔ لاہور میں جو پنجاب کا قدیمی تعلیمی مرکز ہے اس زمانے میں امریکن چرچ نے فورمین کرسچین کالج کی بنیاد رکھی جو کلکتہ یونیورسٹی کے ساتھ بھی ایک مدت تک ملحق رہا ہے۔ یہ درسگاہ خالصتًا عیسائی تھی اور پنجاب میں عیسائی اور مغربی افکار کی تبلیغ کا فرض بھی ادا کرتی تھی۔ چونکہ پنجاب یونیورسٹی سے بھی قدیمی تھی اس لئے تعلیمی حلقوں میں اس کا وقار بہت بلند تھا۔ کمال الدین نے اسی درسگاہ میں اپنے کالج کے ایام گذارے۔ اور ۱۸۹۳ء میں بی اے کی سند یونیورسٹی کے اعزازی میڈل کے ساتھ حاصل کی۔ یہاں معاشیات ان کا ایک انتخابی مضمون رہا۔ کالج کے اس دور میں کمال الدین عیسائیت سے بیحد مرعوب ہوئے پادری یوانگ جو درسگاہ کا شیخ الجامعہ (پرنسپل) تھا اس طالب علم کے اس رجحان کو دیکھتے ہوئے اس پر بہت مہربان تھا۔ کمال الدین انجیل کا بیشتر مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ اس مطالعہ اور تبادلۂ خیالات نے کمال کو آہستہ آہستہ عیسائیت کی دہلیز پر لا پھینکا اور وہ بپتسمہ لینے کے لئے تیار ہو گئے۔ ان ایام میں وہ اپنے روایتی اور آبائی مذہب اسلام کے متعلق شک میں پڑ گئے اکثر علماء اور مسلم خطیب ان کے شبہات کا ازالہ کرنے سے قاصر رہتے اس صورت حال نے انہیں اور بھی اسلام کی صداقت اور مستقبل سے مایوس کر دیا۔ یہ انیسویں صدی کا وہ گھناونا اور یاس انگیز دور تھا جب اسلامی تمدن اور تہذیب بڑی طرح پامال ہو چکی تھی اور مغربی فکر و عمل نے اپنی برتری سے نگاہوں کو خیرہ کر دیا تھا۔

کمال جب یہ ارادہ کر چکے تو انہیں ایک کتاب "براہین احمدیہ" ہاتھ آگئی۔ یہ انیسویں صدی کا بہترین سرمایہ ہے حضرت مرزا غلام احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی عمیق نگاہی اور سلجھی ہوئی طرز تحریر نے کمال کو حیرت میں ڈال دیا۔ عقل محض اور وحی کے اس بہت بڑے مقالہ میں جس قوت، صفائی، نکھار اور صحیح فہمی کے ساتھ حضرت مرزا غلام احمدؒ نے دین اور لادینی کی بنیادی بحث کو اٹھایا ہے۔ کمال کے لئے یہ بالکل نئی بات تھی۔ کیونکہ اب بنیادی مسئلہ خود دین تھا نہ کہ اسلام اور عیسائیت ہندومت یا یہودیت۔ اگر یہ بنیاد قائم ہو جاتی تو پھر اسلام یا عیسائیت کے انتخاب کا سوال اٹھ سکتا ہے اور اگر یہ بنیاد ہی قائم نہیں رہتی تو پھر اسلام یا غیر اسلام کی بحث چھیڑنا وقت ضائع کرنا اور انسانوں کو تباہی کی طرف دھکیلنا ہے۔ کمال کیلئے یہ دنیا اب بالکل نئی تھی۔ وہ فوراً قادیان گئے جو حضرت مرزا غلام احمدؒ کا مولد و مسکن تھا۔ یہ ۱۸۹۳ء یا ۱۸۹۴ء سے قبل کا واقعہ ہے۔ حضرت مرزا غلام احمدؒ کی شخصیت اور رعنائی ظرفی نے کمال کو متحیر کر دیا۔ اور اب وہ عالم اسلام کی بہت بڑی انقلابی تحریک احمدیت میں شریک ہو گئے۔

یہاں سے لوٹ کر کمال اسلامیہ کالج لاہور میں لکچرر ہو گئے۔ لیکن زندگی ایک نئی راہ پر چل پڑی تھی۔ نصف رات گئے

اُٹھکر مالک زمین وآسمان کے سامنے جُھک جانا، اور فغانِ سحری میں انسانوں کے دکھی دلوں کا مرہم تلاش کرنا کمال کا شیوہ ہوگیا۔ حضرت مرزا غلام احمدؒ کے ساتھ کمال کو بہت عقیدت تھی اور یہ عقیدت فی الحقیقت فنائیت کے مقام تک پہنچ چکی تھی اسی دوران میں کمال نے قانون کا مطالعہ شروع کیا اور پشاور جاکر اس میں پریکٹس جاری کی۔ کمال کی عقیدت کا ایک مشہور واقعہ یہاں بیان کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ حضرت مرزا غلام احمد صاحبؒ کی مخالفت برکوچک ہند میں نہایت شد و مد سے ہو رہی تھی۔ اور مخالف ہر ممکن طریق سے انہیں زک پہنچانا چاہتے تھے۔ امرتسر میں امریکن چرچ کے ایک مناد ہنری مارٹن کلارک نے اس مخاصمت کے باعث حضرت مرزا غلام احمدؒ پر قتل عمد کا الزام لگایا اور انہیں عدالتوں میں کھینچا۔ کمال کو جب یہ خبر ہوئی تو وہ پشاور سے قادیان چلے آئے۔ اور خود مقدمے کی پیروی شروع کردی۔ اسی اثنا میں کمال کا ایک بچہ بیمار ہوگیا تو پشاور سے انہیں ایک خط بلانے کا آگیا۔ کمال نے جواب میں لکھا کہ دوا دارو کرو، اور دعا کا سہارا لو۔ کچھ روز کے بعد بچے کی دردناک حالت کا تار آگیا۔ تو کمال پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوئے اور صبر و تحمل کا تار دے دیا۔ اور پھر آخر میں ایک تار آگیا کہ بچہ فوت ہوگیا ہے تو کمال نے اسے دفنانے کا تار دیا۔ یہ وہ انہماک اور عقیدت تھی جو حضرت کمال کو موجودہ دور کے بہت بڑے انسان حضرت مرزا غلام احمدؒ سے تھی۔

اب کمال بہت زیادہ دینی امور میں منہمک ہو گئے تھے زندگی کے چالیس سال گذر چکے تھے۔ اور کمال کے طرز فکر و عمل میں پختگی آچکی تھی۔ اب وہ کمال ایک معمولی انسان نہیں بلکہ ایک بہت بلند صوفی تھے۔ لیکن ابھی تک وہ مقام نہ آیا تھا جس نے کمال کو دوام بخش دیا۔

۱۹۱۲ء میں کمال نے ایک حیرت انگیز قدم اُٹھایا۔ ساڑھے تیرہ سو سال سے اسلام کی حدود مشرق میں محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ اب مغربی فکر نے اور بھی مشرقی ذہن کو مرعوب کن طریق پر مفلوج کر دیا تھا۔ مغرب علم اور تہذیب کا مشعل بردار تھا اور اسے یہ کہنا کہ مغرب تباہی کے گڑھے پر کھڑا ہے انتہائی دشوار مرحلہ تھا۔ اسلام کی انقلابی اقدار کی شکستگی کا خود مسلمانوں کا شعور ہی نہیں بلکہ یقین تھا۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اسی کے متعلق ایک نظم لکھی کہ مغرب میں اسلام کا پرچار چنداں فائدہ مند نہیں کیونکہ سفید قومیں پھر بھی سیاہ قوموں پر حاکم رہیں گی۔ اس لئے سیاہ قوموں کی مختاری کے لئے جدوجہد کرنی چاہئے لیکن رومن ایمپائر اتنی وسیع، ترقی یافتہ، اور علم و فضل میں برتر نہیں تھی جس قدر کہ برطانوی سلطنت تھی۔ اس کے فلسفہ، سائنس علم وحکمت اور ظاہری شان و شکوہ کا لگا دنیا میں کوئی بھی نہیں کھا سکتا تھا۔ اتنی بڑی سلطنت اور اتنے اونچے ایوان کے مقابل کھڑے ہونیکی سعادت کمال کو نصیب ہوئی اور اب کمال، ایک معمولی کمال نہیں بلکہ حضرت عیسیٰ کے ان حواریوں کا عکس ہوگیا جنہوں نے پیگن رومن ایمپائر کو ہلا دیا تھا۔ سینٹ کمال مسیحی نفس تھے اور یہ مسیحیت اسے حضرت مرزا غلام احمد صاحب سے میسر آئی تھی۔

سینٹ کمال اب ایک خواجہ کمال الدین نہیں تھے بلکہ برِ عظیم یورپ پر، کفرہ جاہلیت کے مرکزوں میں۔ اسلام کے پہلے

سب سے بلند نمائندہ سمجھے ... وہ اس وقت انگلستان کا سینٹ پیٹر اور سینٹ جیرم بھی ہے اور ہندوستان کا معین الدین چشتی بابا فرید شکر گنج اور علی ہجویری داتا گنج بخش بھی۔ وہ پہلا انسان تھا جس نے باقاعدہ طور پر انگلستان مملکت عظمیٰ برطانیہ کے دل میں اذان بلند کی اور لوگوں کو آنے والے عذاب سے ڈرا کر اسلام کی طرف بلایا۔ یہ ایک بہت بڑی جرأت تھی اور یہ جرأت صرف سینٹ کمال کو نصیب ہوئی۔ آنے والے مؤرخ جب بھی یورپ کی تاریخ لکھیں گے تو اولیت کا سہرا حضرت مرزا غلام احمدؑ کے ایک حواری کمال کے سر ہوگا۔

لوگ ہنستے تھے۔ کمال کا دماغ چل گیا ہے لیکن کمال ایک ولی تھا۔ مردِ مومن جس کی نظریں دور اُبھرتے ہوئے ہلال کو بخوبی دیکھ رہی تھیں۔ کمال روز و شب اپنے کام میں مشغول رہے۔ دن رات دعوت وسیع سے وسیع تر ہوتی گئی۔ بڑے بڑے بیرن اور لارڈ مسلمان ہو رہے تھے لیکن یہ رفتار ابھی سست تھی۔ لیکن آرک بشپ آف کنٹربری اسلام کی اولین تاریخ سے شناسا ہیں کہ وہ شروع میں بھی کچھ کرتا ہے۔ اور اس بات کا انہوں نے خود تذکرہ بھی کیا اور لوگوں کو اس خطرہ سے آگاہ کیا۔ پندرہ سال مسلسل محنت نے کمال کی صحت پر بڑا اثر کیا۔ وہ واپس پنجاب لوٹے پانچ سال بیمار رہے لیکن کام ترک نہیں کیا۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۳۲ء کو وفات سے چند گھنٹے قبل قرآن پاک کی تفسیر کے نوٹ لکھے جو بدقسمتی سے مکمل نہیں ہو سکی۔

سینٹ کمال اپنی انتھک مساعی کے باعث تمام حلقوں میں معروف ہیں انڈونیشیا سے انگلستان تک اس مردِ مجاہد کی جولان گاہ تھی جس میں قرآن کی امانت کو سینے سے لگائے ہوئے انہوں نے امرِ حق کی دعوت دی سینٹ کمال کی بیسیوں کتابیں ان کی ذہنی اور علمی برتری کی دلیل ہیں جنہیں "نبوت کا ظہورِ اتم" "ینابیع المسیحیت"۔ "روحانیت فی الاسلام"۔ "توحید فی الاسلام" "انجیل عمل" اور "اُمّ الالسنہ" سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ سینٹ کمال انگریزی مخاطبوں کی فطرت اور طرزِ ردِ عمل سے بخوبی شناسا معلوم ہوتے ہیں۔ اُسقفِ سالسبری کے نام جو مکتوب اُنہوں نے لکھا ہے وہ اپنی طرزِ تحریر، انشاء اور نفسِ مضمون کے اعتبار سے منفرد ہے۔ خود آرک بشپ آف کنٹربری جو پروٹسٹنٹ چرچ اور اینگلیکن چرچ کے راہنما ہیں یہ مان گئے کہ ووکنگ کو انگلستان میں کنٹربری کی حیثیت حاصل ہے۔ گو آج بھی کئی اور مساجد اور ادارے انگلستان میں اس فریضۂ تبلیغ کو ادا کر رہے ہیں۔ لیکن ہنوز ووکنگ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ سینٹ کمال نے دعوت کو اور وسیع کرنے کے لئے انگریزی ماہنامہ "اسلامک ریویو" اور اردو ماہنامہ اشاعت اسلام جاری کئے۔ کمال نے اپنے کئی ساتھیوں کو بیحد متاثر کیا۔ ووکنگ مسلم مشن ہمیشہ سینٹ کمال کی یادگار رہے گا۔

نئے تقاضوں اور مسائل کی جانچ دردِ دل کے ساتھ کریں۔ انسانی اخلاقی حس ہی بچھڑے ہوئے انسانوں کو قریب لا سکتی ہے

مملکتِ پاکستان کی اسلامی اساس

مملکتِ پاکستان کی اسلامی اساس پر نکتہ چینی کرنے والوں کے تین گروہ ہیں:۔

ایک گروہ تو یہ کہتا ہے کہ یہ جمہوریت ہی نہیں ہے۔ دوسرا گروہ اس غلط فہمی کے ماتحت کہ یہ ایک قسم کی فرقہ وارانہ حکومت ہے اسکو بنظرِ حقارت دیکھتا ہے۔ تیسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ جس اساس پر یہ مملکت قائم ہوئی ہے اس کی رُو سے پاکستان کی جملہ اقلیتیں مٹ جائیں گی۔

لیکن اس کے جواب میں مَیں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جس قسم کی جمہوریت کے یہ حضرات حامی ہیں خدا کرے کہ ایسی جمہوریت کبھی بھی ظہور میں نہ آئے۔ وزیرِ اعظم پاکستان نے جو قرارداد مقاصد پیش کی اور جس کو دستور ساز اسمبلی نے پاس کیا اس کی تہ میں کیا ہے؟ اس قرارداد میں صریح الفاظ میں موجود ہے کہ سلطنت اپنے اختیارات کو عامۃ الناس کے منتخب کردہ نمایندوں کے ذریعہ استعمال کرے گی اور تمام پبلک کے بنیادی حقوق کی حفاظت کرے گی۔ قانون کے سامنے سب برابر ہوں گے سب کو عمرانی۔ اقتصادی اور سیاسی ترقی کا موقعہ دیا جائے گا اور سب کو خیالات اعتقادات اور مذہب اور عبادات کی آزادی ہوگی۔ اور اقلیتوں کو اجازت ہوگی کہ وہ اپنے مذہب کے پابند رہیں اور اپنی اپنی کلچر کو ترقی دیں۔

کیا یہ اصل اور صحیح جمہوریت نہیں ہے؟ ضرور ہے۔ برطانوی پریس کے بعض نکتہ چینوں نے قرارداد کی سپرٹ اور اس کی مذہبی رنگ کی زبان پر حملہ کیا ہے۔ لیکن یہ اعتراض بھی بے معنی ہے کیا خود برطانوی حکومت اصولاً ANGLICAN CHURCH - اینگلیکن چیرچ کی اُصولوں پر مبنی نہیں ہے؟ اگر بادشاہ اپنا ANGLICAN - FAITH بدل لے۔ اور کوئی دوسرا عیسائی عقیدہ اختیار کرلے کیا وہ سلطنت متحدہ اور دولتِ مشترکہ کا بادشاہ رہ سکے گا؟ کیا سلطنت کا کوئی ولی عہد کسی غیر عیسائی یا NON - ANGLICAN عورت سے شادی کرسکتا ہے؟

کیا غیر فرقہ وارانہ سلطنت متحدہ میں غیر عیسائی لوگوں کی شادیاں بذریعہ قانون ممنوع نہیں ہیں؟ کیا مذہبی تعلیم سلطنت کے تمام سکولوں حتیٰ کہ لنڈن کونسل سکولوں میں جو خالصتاً سرکاری سکول ہیں نہیں دی جاتی؟ یہ کس قسم کی غیر فرقہ وارانہ حکومت ہے؟ اس کو کس طرح غیر فرقہ وارانہ حکومت قرار دیا جاسکتا ہے؟

یہ تو جواب ہے پہلے دو قسم کے نکتہ چینوں کا۔ اب رہی تیسری قسم۔ اسکو ہم قرآن مجید کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ قرآن مجید نے ساری مخلوق کو اخوت کا پیغام دیا ہے اور ہر شخص کو آزادی دی ہے اور ہر شخص کے ساتھ انصاف اور خوش معاملگی کی

تاکید کی ہے۔

حضرت نبی کریم صلعم نے فرمایا:-

"جو شخص خدا کی مخلوق سے اور اپنے بچوں سے مہربانی اور شفقت نہیں کرتا خدا اُس پر مہربانی اور شفقت نہیں کرے گا"

حجۃ الوداع کے دن ہمارے نبی کریم صلعم نے فرمایا:-

"یاد رکھو تم سب بھائی بھائی ہو- تمام مخلوق خدا کی نظروں میں یکساں ہے۔ اور تمہارے مال اور تمہاری جانیں سب پاک ہیں۔ کسی حالت میں تم کو ایک دوسرے کے مال اور جان پر حملہ نہیں کرنا چاہیئے۔ آج میں تمام ذاتوں، رنگوں اور قومیتوں کو اپنے پاؤں کے نیچے روندتا ہوں۔ تمام لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم خاک سے تھا"

کوہ سینا کے آرچ بشپ پورفی ریس نے ۱۹۳۷ء میں حکومت مصر کو ایک درخواست دی تھی جس میں اس نے لکھا تھا۔

"یہ خانقاہ بکمال حفاظت و احتیاط اس دستاویز کو اپنے پاس محفوظ رکھتی ہے جو اپنی نوعیت میں بہت بیش بہا ہے۔ یہ دستاویز وہ معاہدہ ہے جس کے ذریعے محمدؐ نے سن ہجری کے دوسرے سال ۳ محرم کو اس خانقاہ کو اس کے تمام حقوق عطا کئے۔ یعنے ہماری تمام زمینوں اور ہمارے اموال اور دوسرے مقبوضات کو ٹیکسوں سے مستثنیٰ کر دیا۔ نہ صرف اس زمانہ کے لئے ہی بلکہ آیندہ زمانہ کے لئے بھی یوم قیامت تک آپ نے یہ معافی تامہ رحمت فرمایا۔ یہ معاہدہ آپکے داماد علیؓ ابن ابی طالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود ہے۔ اور اس پر پیغمبر محمد (صلعم) کے دستخط ثبت ہیں اور آپکے دوسرے صحابہ کے دستخط بھی ثبت ہیں جو اس معاہدہ کی تحریر کے وقت موجود تھے۔ علاوہ دیگر امور کے پیغمبر صاحب نے تمام مسلمانوں کو نصیحت کی ہے کہ وہ ہمارے فرقہ کو لوگوں کی دستبرد اور ان کے ظلم سے بچائیں خواہ وہ اندرونی ہو یا بیرونی"

میڈم جینے آبرٹ جو ایک فرانسیسی خاتون تھیں انھوں نے اس چارٹر کو ایک کتابی شکل میں ۱۹۳۸ء میں پیرس میں شائع کیا تھا۔ اس کتاب میں اصل تحریر کی نقل دی گئی ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں میڈم شاکر محمدؐ نے کیا تھا اور اسلامک ... میں شائع بھی ہو گیا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ، خلیفہ ثانی نے اپنے عہد خلافت میں اس معاہدہ کی تجدید کی اور فرمایا کہ:-

"میں عرب اور غیر عرب میں کوئی امتیاز نہیں کروں گا اور اپنے نبی مقتدا کے نقش قدم پر چلوں گا"

مدینہ میں مسلمانوں کو یہودیوں سے بھی واسطہ پڑا۔ اور مدینہ کی اسلامی سلطنت کو جو ابھی ابتدائی حالت میں تھی اسکو صرف مسلمانوں کی غور و پرداخت ہی نہیں کرنی پڑتی تھی بلکہ یہودیوں کی بھی خبر گیری کرنی پڑتی تھی۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عاقبت اندیشی اور دانائی کا ثبوت اس چارٹر سے بھی ملتا ہے جو آپ نے یہودیوں

کو مرحمت فرمایا جس میں آپ نے تحریر فرمایا کہ :-

" وہ مدینہ کے ایسے ہی شہری ہیں جیسے کہ مسلمان۔ اور یثرب کے باشندوں کے دو طبقے ایک ہی قوم کا حکم رکھتے ہیں اور جو کوئی کسی جرم کا مرتکب ہو گا وہ بلا لحاظ مذہب و ملت مستوجب سزا ہو گا۔ اور دونوں قومیں ضرورت کے وقت مدینہ کی حفاظت کریں گی۔ اور جو تنازعے برپا ہوں گے اُن کا فیصلہ خود نبی کریم صلعم کریں گے "

قرآن مجید نے مکہ والوں کو یہ پیغام دیا :-

" لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ " یعنی تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے میرا دین"

اسلامی آئین حکومت میں جس کو ابن ابی ربیع نے مرتب کیا ذمیوں کو حق دیا گیا ہے کہ وہ اپنے دیوانی مقدمات اپنے ججوں سے ہی فیصلہ کرایا کریں اور حکومت کو ان کے اندر مداخلت کا حق حاصل نہیں ہو گا۔

اس زمانہ میں بھی جبکہ اسلامی سلطنت بہت ترقی کر گئی حکومت اسلام نے غیر مذاہب والوں کو کامل مذہبی آزادی دے رکھی تھی۔ اور نسل اور رنگ و روپ کی کوئی تمیز روا نہیں رکھی جاتی تھی۔ مذہبی رواداری جو مسلمان حکمرانوں نے اپنی غیر مسلم رعایا کو دی اس کا عشر عشیر مغربی دُنیا میں ہزاروں سال تک بھی نہیں ملے گا۔ معتصم خلیفہ کا پہلا وزیر اعظم ایک عیسائی تھا جس کا نام فضل ابن مردان تھا۔ اسی طرح ان کے دربار میں بہت سے عیسائی وزراء اور عیسائی اہل علم تھے۔ واضع قوانین ابن ربیع اس بات کو خوب سمجھتا تھا کہ رعایا کے تمام طبقوں میں انصاف اور عدل قائم رکھنا استحکام سلطنت کے لئے ازبس ضروری ہے۔ اس نے نہایت صریح اور واضح الفاظ میں یہ اُصول قائم کیا کہ سلطنت کی فلاح و بہبود کے لئے لازمی ہے کہ تمام مذاہب اور تمام نسلوں اور اقوام کے درمیان عدل و انصاف روا رکھا جائے۔ اور سب کو مساوی حقوق دیئے جائیں۔

سیف الدولہ کے عہد حکومت میں جس کے دربار کا بہت بڑا متفنن فارابی تھا باوجود اس امر کے کہ بعض مسلمان اس کو ایک غیر اسلامی امر قرار دیتے تھے تمام غیر مسلم اقوام کو پوری پوری مذہبی آزادی حاصل تھی۔ اور یہودی اور عیسائی اور زرتشتیوں کو پورا پورا حق حاصل تھا کہ جس طریق پر وہ چاہیں عبادت بجا لائیں۔

خود ہندوستان کے اندر دیکھو مغلوں نے بڑے بڑے ذمہ داری کے عہدے ہندوؤں کو دے رکھے تھے۔ مثلاً محکمۂ مال اور محکمۂ دفاع سب ہندوؤں کے سپرد تھے۔

اس زمانہ میں بھی ریاست حیدر آباد میں ۵۵۰۰ سے زیادہ مندر اور ہندوؤں کے ادارے ایسے ہیں جن کی غور و پرداخت نظام حیدر آباد کرتا ہے۔ یہی ایک مثال اپنی نظیر آپ ہے۔ اسی طرح دوسرے اسلامی ممالک میں عیسائی اور یہودی برسر اقتدار نظر آتے ہیں۔ گذشتہ سال اقوام متحدہ میں شام کا نمائندہ ایک عیسائی تھا۔ عرب لیگ آفس کے لنڈن بیورو کا افسر اعلیٰ ایک عیسائی ہی تھا۔ خود پاکستان کی کیبنٹ کا ایک وزیر ہندو ہی ہے۔

اور بابائے ملت حضرت قائد اعظم علیہ الرحمۃ کا قول ہے کہ :-

"مجھے کسی قوم کسی ملت سے نفرت نہیں ہے - میں سب کو محبت اور عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور اقلیتوں کے حقوق کا سب سے بڑا محافظ ہوں"۔

پاکستان کی اقلیتوں کو بابائے ملت کے ان الفاظ پر پورا پورا بھروسہ رکھنا چاہیئے اور انہیں یقین رکھنا چاہیئے کہ ان کے حقوق کو کوئی چیز پائمال نہیں کر سکتی - پاکستان کا کوئی فرد یہ حرکت نہیں کر سکتا کہ وہ اپنے محبوب لیڈر کے خلاف ذرہ بھر ادھر اُدھر ہو۔

پاکستان کی اقلیتوں کو ذرا خائف نہیں ہونا چاہیئے کہ مسلمان قرارداد مقاصد کے اس حصہ کے خلاف قدم اٹھائیں گے جس میں ان کے حقوق کے تحفظ کا وعدہ دیا گیا ہے اور جس میں ان کی مذہبی، ثقافتی اور دیگر امور کی آزادی کو برقرار رکھا گیا ہے۔ جب خود وزیر اعظم مملکت پاکستان نے ایک عہد دے دیا ہے کہ اس کی سلطنت اقلیتوں کے حقوق کی محافظت کرے گی وہ خود اس امر کا ذمہ دار ہے کہ قوم سے اس عہد کی پابندی کرائے - یہ ایک اسلامی قانون ہے اور جو کوئی اس قانون کو توڑے گا اس کے لئے اس مملکت پاکستان میں کوئی جگہ نہیں ؛

(ترجمہ مجلہ اسلامک ریویو)

جماعت احمدیہ لاہور کے موقف اور مسلک کو سمجھنے کے لئے آپ ان رسائل اور جرائد کا مطالعہ کریں یہ آپ کو موجودہ بحرانی دور سے نجات دلانے میں اپنے نظریہ سے شناسا کریں گے۔

پاکستان میں :- ہفت روزہ "پیغام صلح" لاہور (اردو)
ہفت روزہ "لائٹ" لاہور (انگریزی)

ھندوستان میں :- ماہنامہ "شانتی سندیش" بمبئی (گجراتی)
روزنامہ "آزاد نوجوان" مدراس (اردو)
ہفتہ روزہ "کتھرلر" مدراس (انگریزی)
ہفت روزہ "روشنی" سرینگر (اردو)

دیگر معلومات کیلئے :- دفتر نشر یات احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور سے رجوع فرماویں

اسلامی تہذیب کا تصوّر

مولانا مصطفیٰ خان صاحب بی۔ اے مرحوم

ایک گذشتہ مجلس میں ہم اس موضوع پر بحث کر چکے ہیں کہ انسان نے بتدریج سائنس کے انکشافات میں عناصر قدرت کو اپنے تصرف میں لانے۔ تمدن کے قائم کرنے اور امور دنیوی کو منتظم کرنے میں کس طرح ترقی کی۔ ہم اس موضوع کو بھی زیر بحث لا چکے ہیں کہ کس طرح ایک قوم دوسری قوم سے معرکہ آرا ہوتی رہی۔ اور ایک ہی قوم کے مختلف گروہ ایک دوسرے پر چیرہ دستی کرتے ہے۔ اور کس طرح ہر مرحلہ پر انسانی تہذیب کے ارتقا میں ان قومی چپقلشوں اور خصومتوں کی وجہ سے روک پیدا ہوتی رہی۔ اس ہمارے زمانہ میں بھی جبکہ دنیا اپنی مادی ترقی کی وجہ سے انتہائی تہذیب کو پہنچ چکی ہے۔ ہم اس بارہ میں کوئی خاص فرق اور امتیاز نہیں دیکھتے۔ اب بھی قومیں باہم معرکہ آرائی میں مصروف ہیں۔ اب بھی ان میں تنازعے اور جھگڑے چلے جاتے ہیں۔ یوروپ کی گذشتہ دو بڑی جنگیں دنیا نے تہذیب کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہیں۔ مادی ترقی اور روزافزوں سائنس کی ایجادات نے نسل انسانی کو تباہ و برباد کرنے کے لئے انسان کے ہاتھ میں پہلے سے بھی زیادہ خطرناک ہتھیار دے دیئے ہیں۔ اور دنیا سے امن اور چین کے مواقع یوماً فیوماً مفقود ہو رہے ہیں۔ زمانہ حاضرہ کے بڑے بڑے مفکرین نے اس مسئلہ پر بہت غور و خوض کیا ہے کہ کس طرح دنیا میں امن و امان قائم کیا جائے اور قوموں کی باہمی جنگ و جدل کو صلح میں تبدیل کیا جائے۔ لیکن مقام حیرت ہے کہ اس کے حل میں وہ ناکام ثابت ہوتے ہیں۔ یہ مسئلہ کیونکر حل ہو؟ اور یہ مقصد کیونکر حاصل ہو۔ بہیمیت کا عنصر جو انسان کو بربریت پر مائل کرتا ہے اسکو کس طرح سے کچلا جائے؟ ایک دوسرے پر تفوق اور برتری کا جو جذبہ امن عامہ میں خلل انداز ہو رہا ہے اسکو مزاجوں سے کس طرح نکالا جائے؟ یہ سوالات زمانۂ حاضرہ کی مہذب دنیا کے لئے بہت بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ آیئے ان سوالات کا حل ہم اسلامی نکتہ نگاہ سے تلاش کریں۔

اس باب میں ہمیں قرآن مجید سے روشنی حاصل کرنی چاہیئے۔ اور ایسے مسائل کا حل جنہوں نے عقلائے زمانہ کو ورطۂ حیرت میں غرق کر رکھا ہے۔ قرآن مجید سے ہی کرنا چاہیئے۔ قرآن مجید کے بعد دوسری چیز جو ہماری صحیح رہنمائی کر سکتی ہے وہ جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مطہرہ مقدسہ اور حضور صلعم کا اسوۂ حسنہ ہے۔ یہ دو چیزیں ہیں جن کی روشنی میں ہم مشکلات کے کٹھن راستہ طے کر سکتے ہیں۔

انسان کی خلافت

سب سے پہلے ہمیں قرآن شریف سے یہ دیکھنا ہے کہ اس مقدس کتاب نے انسان کا کیا مرتبہ قرار دیا ہے۔ اور اس کی حیثیت کیا ہے۔ قرآن مجید میں انسان تمام مخلوقات کا مخدوم قرار دیا گیا ہے۔ یہ صاف لفظوں میں مذکور ہے کہ انسان زمین پر حکومت کرنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ اور اس حکومت کے لئے اس کو بڑی بڑی استعدادیں اور قوتیں دی گئی ہیں۔

قرآن مجید نے استعارہ کے رنگ میں آفرینش انسان کا ذکر کیا ہے اور ملائکہ پر اس کی فوقیت اور ان کو اس کی اطاعت کا حکم دیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کو کائنات میں سب سے بلند حیثیت حاصل ہے۔ ہم اس امر کو ذرا وضاحت سے بیان کرنا چاہتے ہیں تاکہ اس کے متعلق کوئی ابہام باقی نہ رہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے:۔

وإذ قال ربك للملائكة انی جاعل فی الارض خلیفة قالوا اتجعل فیها من یفسد فیها ویسفك الدماء ونحن نسبح بحمدك ونقدس لك قال انی اعلم ما لا تعلمون۔ وعلم آدم الاسماء كلها ثم عرضهم علی الملائكة فقال انبئونی باسماء هؤلاء ان كنتم صادقین ۰ قالوا سبحانك لا علم لنا الا ما علمتنا انك انت العلیم الحكیم۔ قال یا آدم انبئهم باسمائهم فلما انباهم باسمائهم قال الم اقل لكم انی اعلم غیب السموات والارض واعلم ما تبدون وما كنتم تكتمون ۰ واذ قلنا للملائكة اسجدوا لآدم فسجدوا الا ابلیس۔ ابی واستكبر وكان من الكافرین ۰ (سورۃ بقرہ آیت ۳۰-۳۴)

"اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں تو انہوں نے کہا کیا تو اس کو خلیفہ بناتا ہے جو اس میں فساد کرے اور خون گرائے اور ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے اور تیری تقدیس کرتے ہیں۔ خدا نے کہا میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اور (خدا نے) آدم کو تمام چیزوں کے نام سکھائے۔ پھر ان کو فرشتوں کے پیش کیا اور کہا ان کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو انہوں نے کہا تو پاک ہے۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں سوائے اس کے جو تو نے بتایا کیونکہ تو جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ خدا نے کہا اے آدم ان کو ان کے نام بتاؤ۔ پس جب اس نے ان کو بتائے تو خدا نے کہا کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی چھپی باتیں جانتا ہوں اور میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپاتے ہو اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے اس نے انکار کیا اور وہ ...... منکروں میں سے ہو گیا۔"

قرآن مجید کے یہ الفاظ مختصر طور پر مگر بڑی صفائی سے اس کا نقشہ کھینچتے ہیں جو انسان نے اس دنیا میں کیا ہے۔ بیشک انسان نے اس زمین میں حکومت کی ہے۔ اس نے قدرت کے قوانین کا پتہ لگایا ہے۔ اور مادہ کی مختلف خاصیتیں

معلوم کی ہیں۔ اس نے زمین پر فساد بھی کیا اور خونریزی بھی کی۔ اور جو چیز اس کے سامنے آئی اسکو اس نے اپنا مطیع بنایا۔ لہذا کائنات پر اسکی حکومت اور اس کا تفوق ایک مسلّم امر ہے۔ یہ بھی بدیہی طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کو جو یہ برتری حاصل ہے تو اس کی بڑی وجہ وہ طاقتیں اور استعدادیں ہیں جو خدا نے اسکو دی ہیں ایک سائنسدان کے الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ انسان کے عجیب وغریب دماغ نے عجیب غریب کام کر کے دکھائے ہیں،

لیکن یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ خدا نے اسکو ہر نوع کے قوےٰ بخشے ہیں جن کے ذریعہ وہ اشیاء کی ماہیت کا تجزیہ کرنے اور قوانین قدرت اور عناصر قدرت کے خواص معلوم کرنے پر قادر ہے۔ قرآن شریف کے الفاظ میں اسکو خدا نے اشیاء کے نام کی تعلیم دی ہے۔" قرآن نے "اشیاء کے نام" کا ذکر کیا ہے کیونکہ عربی میں کسی چیز کا نام اس چیز کی خاصیت اور اس کی ماہیت پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے "نام" سے یہاں مطلب چیزوں کے خاص یا ان کی صفات ہیں۔ اس طرح سے انسان کی عظمت کا راز اس کا علم ہے۔ اور قرآن مجید کے ارشاد کی تصدیق بنی نوع انسان کی تاریخ سے ہوتی ہے۔ جس قدر انسان علم میں ترقی کرتا ہے اسی قدر بڑا وہ ہو جاتا ہے۔ دنیا میں اس کی فتوحات اس کے علم اور سائنس کے تناسب سے ہوئی ہیں۔ فی الحقیقت واقعات کی شہادت اور نسل انسانی کی تاریخ قرآن مجید کی آیات کی بہترین تفسیر ہے۔ زمانہ حاضرہ کی ایجادات جنہوں نے دنیا کی تہذیب کو چار چاند لگا دیئے ہیں وہ انسان کے ازدیاد علم کا نتیجہ ہی ہیں۔ قوانین قدرت پر انسان کی حکومت نے اسکو دنیا میں ایک بے نظیر حیثیت کا مالک بنا دیا ہے۔

خدا کی ہدایت

لیکن اگر خدا نے انسان کو بڑی وسیع طاقتیں بخشی ہیں جن سے وہ علم حاصل کر سکتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی ہدایت بھی عطا فرمائی ہے تا وہ نیکی اور راستبازی کی راہ پر چلے۔ قرآن مجید اس ہدایت کا مندرجہ ذیل الفاظ میں ذکر کرتا ہے۔

وقلنا یاآدم اسکن انت وزوجك الجنة وكلا منها رغداً حيث شئتما ولا تقربا هذه الشجرة فتكونا من الظلمين ط اور ہم نے آدم سے کہا کہ اے آدم تو اور تیری بیوی اس باغ میں رہو اور اس سے جو تم چاہو فراغت سے کھاؤ مگر اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ تم ظالم ہو جاؤ گے۔

فازلهما الشيطن عنها فاخرجهما مما كان فيه وقلنا اهبطوا بعضكم لبعض عدوٌ ولكم في الارض مستقرٌ ومتاعٌ الى حين ٥ فتلقى آدم من ربه كلمات فتاب عليه انه هو التواب الرحيم ٥ وقلنا اهبطوا منها جميعا فاما يأتينكم مني هدىً فمن تبع هداى فلا خوفٌ عليهم ولا هم يحزنون ٥ والذين كفروا وكذبوا بايتنا اولئك اصحاب النار هم فيها خالدون ٥

(سورۃ البقرہ آیات ۳۵ - ۳۹)

ترجمہ۔ پس شیطان نے انکو اس سے پھسلایا۔ سو ان کو ان سے نکال دیا جس میں وہ تھے۔ اور ہم نے کہا اتر و تم ایک دوسرے

کے دشمن ہو۔ اور تمہارے لئے زمین میں ایک وقت تک ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ہے۔ پھر آدم نے اپنے رب سے کچھ باتیں سیکھ لیں۔ سو اس نے اس پر رجوع برحمت کیا۔ بیشک رحمت سے رجوع کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ ہم نے کہا اس سے اُتر جاؤ۔ پھر اگر میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے تو جو میری ہدایت پر چلے تو اس کے لئے نہ ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔"

اگر خدا اپنے بندوں کو اپنے پاس سے ہدایت نہ دیتا تو یہ اس کی صفات کے منافی ہوتا۔ انسان کو خدا نے حصول علم کی طاقت عطا فرمائی ہے جس کو وہ اکثر غلط طریقوں پر استعمال کرتا ہے۔ اس لئے یہ خدائی فرمان کے بالکل مطابق تھا کہ اسے سیدھے اور صحیح رستہ کی ہدایت کی۔ قرآن مجید کی مندرجہ بالا آیات جہاں ایک طرف انسان کو اس ہدایت کا وعدہ دیتی ہیں جو وقتاً فوقتاً رسولوں کی معرفت انکو ملتی رہی وہاں دوسری طرف ان کے اندر ایک نصیحت بھی ہے جو ان الفاظ میں مرکوز ہے :-

اسکن انت وزوجك الجنة وكلا رغدا حيث شئتما ولا تقربا هذه الشجرة فتكونا من الظالمین۔ (اے آدم) تو اور تیری بیوی اس باغ میں رہو اور با فراغت کھاؤ جو تم چاہو اور اس درخت کے قریب نہ جاؤ ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ انسان پرندوں اور حیوانوں کی طرح کوئی غیر ذمہ دار ہستی نہیں ہے۔ وہ خاص خاص احکام خداوندی پر عمل کرنے پر مکلف ہے اور سب سے پہلا حکم یہ ہے کہ اسے اپنے ساتھی یا ہمسایہ کا احترام اور پاس رکھنا ہے۔ "شجر ممنوعہ" کے متعلق بہت بحث ہی ہے، بائیبل اسکو برائی بھلائی کے علم کا درخت قرار دیتی ہے لیکن قرآن مجید کے لفظ شجرۃ کے معنے درخت کے بھی ہیں اور جھگڑا کے بھی ہیں۔ قرآن مجید کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کو باغ میں رکھا گیا اور اسکو وہاں با فراغت کھانے پینے کی اجازت دی گئی اس کے ساتھ ہی اسکو حکم ملا کہ وہ اپنے زوج یا ساتھی کیساتھ جھگڑا اور فساد نہ کرے۔ اس طرح سے ابتدائی زندگی میں ہی نیک اور اچھی ہمسائیگی کی تعلیم خدا نے دی۔ چونکہ اس زمانہ کا تعلق اس وقت سے ہے جبکہ انسان جنگلوں میں رہتا تھا اور ایک محنت اور مشقت کی زندگی بسر کرتا تھا اس لئے قرآن مجید کا لفظ شجرۃ کو جو دو معنوں پر مشتمل ہے استعمال کرنا بڑی حکمت پر مبنی ہے۔ قرآن مجید نے زوج کا لفظ استعمال فرمایا جو مرد و عورت دونوں پر استعمال ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے ساتھی یا بیوی کے ساتھ بڑی محبت اور یگانگت سے رہے اور اس سے لڑائی جھگڑا نہ کرے جس سے زندگی تلخ اور جینا دوبھر ہو جائے۔ قرآن مجید کا یہ حکم آج کل بالخصوص اہمیت رکھتا ہے۔ ہمارے بہت سے بین الاقوامی مسائل نیک ہمسائیگی کی روح پیدا کرنے سے حل ہو سکتے ہیں۔ ایک "اسلامی سوسائٹی" ایک اسلامی گھر اور ایک اسلامی ادارہ اگر قرآن کے حکم کے مطابق عمل کیا جائے، اسی دنیا میں بہشت بن سکتا ہے۔ قرآن تو یہ چاہتا ہے کہ ایک دوسرے کی برائی نہ کی جائے ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈا نہ کیا جائے، اور ایک دوسرے کی بدخواہی نہ

کی جائے۔ ایک دوسرے کے متعلق بُرے ارادے نہ رکھے جائیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ حسد نہ کیا جائے۔ اگر قرآن مجید کے احکام اتباع کی جاتے تو اس میں کیا شک ہے کہ دنیا جنت بن جائے اور اس کے اندر رہنے والے سب کے سب خوشی اور خرمی سے زندگی کے دن بسر کریں سے

بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد ÷ کسے را باکسے کارے نہ باشد

اسلام عالمگیر صلح کا پیغام ہے

اسلام جیسا کہ اس کے معنی ہیں دنیا میں امن و صلح کا پیغام لیکر آیا ہے، اسلام لفظ سلام سے مشتق ہے جس کے اصل میں معنی ہیں امن میں ہونا۔ صلح کی حالت میں رہنا۔ اور پھر اسکے معنے ہیں جس کے ساتھ صلح ہے اس کا مطیع ہو جانا۔ انسان کی دوگونہ حیثیت ہے۔ وہ خالق کی پیدائش ہے۔ جس کی محبت اس کی فطرت میں مرکوز ہے۔ پھر وہ بالطبع بھی ہے اور بنی نوع انسان کا جزو ہے۔ وہ تنہا نہیں رہ سکتا۔ اور اس میں ذرا شک نہیں کہ اس کی سوسائٹی کے ساتھ پیوست ہو کر ہی ہو سکتی ہے۔ اس لئے اسلام جو بنی نوع انسان کا مذہب ہے اس کے دو مفہوم پائے جاتے ہیں۔ جب انسان اپنے خالق سے صلح کرتا ہے تو وہ کلیتہً اس کی رضا کا مطیع و منقاد ہو جاتا ہے۔ یا یوں کہنا چاہیئے کہ اپنے آپ کو اعلیٰ ہستی کے حضور میں سربسجود ہو جاتا ہے اور اس کے آستان پر گر جاتا ہے۔ لیکن جب اسے اپنے ہمجنسوں سے معاملہ پڑتا ہے تو ان سے بھی صلح کرتا ہے اور مساویانہ رنگ میں صلح کرتا ہے۔ قرآن مجید نے عالمگیر صلح کا پیغام دیا ہے۔ اور اس پر بار بار زور دیا ہے۔ مسلمانوں کا سلام بھی صلح اور آشتی کا پیغام ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان ہر آن بنی نوع انسان کو صلح کا پیغام دینے کے لئے تیار رہے۔ جس بہشت کا وعدہ مسلمانوں کو دیا گیا ہے۔ اس کا نام بھی دارالسلام ہے۔ یعنے صلح۔ امن۔ آشتی کا مقام۔ وہ جو اس بہشت میں داخل ہوں گے وہ سوائے سلاماً سلاماً کے اور کچھ نہیں سُنیں گے (قرآن شریف سورۃ ۲۶۔ آیت ۲۵) "السلام" کے ایک اسماء میں سے ہیں قرآن شریف سورۃ ۵۹ (آیت ۲۳) ان شواہد سے ظاہر ہے کہ اسلام کا مفہوم اور اسلام کا مقصد اور مطلب صلح اور امن ہے اور ہمارا مذہب سرتاسر صلح اور عالمگیر صلح کا پیغام ہے۔ اور جس چیز کی آج دنیا کو ضرورت ہے وہ صلح ہی ہے۔ اگر اقوام دنیا قرآن کی طرف رجوع کریں تو آج تمام مصائب و آلام سے نجات حاصل کر لیں سے

گوئے توفیق و کرامت درمیاں افگندہ اند ÷ کس بمیدان در نمی آرد سواراں راچہ شد

اسلام جغرافیائی حدود کا پابند نہیں

اسلام صرف عالمگیر صلح کا پیغام نہیں دیتا۔ بلکہ ایک عالمگیر اخوت کا پیغام لے کر آیا ہے۔ قرآن مجید کی رُو سے تمام نسل انسانی ایک ہی قوم کا حکم رکھتی ہے۔ لونی۔ لسانی۔ ملکی اور قومی امتیازات کو اسلام برداشت نہیں کرتا۔ جغرافیائی حدود

خدا کے کنبہ کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں کرسکتی - قرآن مجید کی رُو سے یہ امتیازات محض پہچان کے لئے ہیں زمانۂ قدیم سے انسانی تہذیب کی اساس قبیلوں، فرقوں اور قوموں پر رکھی گئی ہے - یہودی کتب مقدسہ میں بھی ہم ایک قومی معبود کے تخیّل کو پاتے ہیں - یہوواہ یہودیوں کے ربّ منظورِ نظر لوگ اسرائیل ہی تھے - وہی خدا کے پیارے اور محبوب بیٹے ہیں - اور دوسرے لوگ اس کی نظروں میں پیارے اور محبوب نہیں - جناب مسیحؑ جن کے متعلق غلطی سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ انہوں نے بھی دُنیا میں انسانی اخوت کا سبق دیا وہ بھی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کا ہی ذکر کرتے ہیں - اس میں شک نہیں کہ وہ خدا کو آسمانی باپ کہکر پکارتے ہیں - لیکن اس سے یہودیوں کے ربّ کے تخیّل پر کوئی ترقی نہیں پائی جاتی - وہ محض اسرائیلیوں کا "باپ" ہے یہی وجہ ہے کہ جناب مسیحؑ بچوں کی روٹی کتوں کے آگے پھینکنا نہیں چاہتے -

لیکن اسلام کا پیغام ایک عالمگیر حیثیت رکھتا ہے - اور اس کا خدا رَبُّ الْعٰلَمِیْن ہے یعنی سب دنیا سب جہانوں کا ربّ - موجودہ تہذیب بھی قومیت پر مبنی ہے - جس کے اندر اتحادِ مذہب اتحادِ مقاصد، اتحادِ لسان ضروری ہے - لیکن قرآن مجید ان انسانوں کے بنائے ہوئے امتیازات کو کچھ وقعت نہیں دیتا - قرآن مجید میں ہے ربّ المشارق والمغارب یعنے خدا مشرق کا بھی خدا ہے اور مغرب کا بھی مشرقی اور مغربی ممالک اس کے ہی ہیں - ہر ایک ملک کا اپنا اپنا قومی ترانہ ہے جس کو وہ گاتے ہیں اور اس میں وہ دوسروں پر اپنی فوقیت کا اظہار کرتے ہیں - تاکہ اپنے ملک کی محبت کی آگ سینوں میں روشن رہے لیکن اسلام کا قومی ترانہ کیا ہے :-

چین وعرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

ہمارے مقدس نبیؐ نے فرمایا ہے کہ عرب کو عجم پر کوئی فوقیت نہیں ہے - اور نہ عجم کو عرب پر کوئی تفوّق ہے - اس بیان سے ظاہر ہے کہ اسلام جغرافیائی حدود کا قائل نہیں - ان جغرافیائی حدود نے اب تک قوموں کے سیاسی اور تمدنی مسائل کے حل کرنے میں انسانی دماغ پر بُرا اثر ڈالا ہے - اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے - یہ عالمگیر اخوت کو حضرت نبی کریمؐ کے الفاظ نے اور بھی تقویت کا سامان بہم پہنچایا جہاں آپؐ فرماتے ہیں:- "تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک اپنے بھائی کے لئے وہ چیز پسند نہ کرے جو وہ اپنے لئے کرتا ہے" یہ نصیحت قرآن مجید کی تعلیم اخوت کے عین مطابق ہے جو سب سے پہلے دُنیا میں دی گئی -

اسلام اور ضمیر کی آزادی

نسلِ انسانی ایک عرصۂ طویل اور مدّت مدید سے مختلف قسم کی زنجیروں میں جکڑی چلی آتی ہے - کہیں رُسوم

رواج کی زنجیریں ہیں کہیں ذات پات کی زنجیریں اور کہیں سیاسی اور تمدنی نوعیت کی زنجیریں۔ لیکن شاید سب سے بدتر زنجیر وہ ہے جس کی وجہ سے انسان اپنے دل کی آواز کا اظہار نہ کر سکے یہ سب سے بڑی لعنت اور انسانی تہذیب پر بہت بڑا تعطل ہے۔ یہ انسان کے تولئے عقلیہ فکریہ کو زنگ لگا دیتی ہے۔ اور زندگی کو بے جان بنا دیتی ہے۔ سقراط حکیم کو زہر کا پیالہ پلایا گیا کیونکہ اس کی تعلیمات جمہور کو پسندیدہ نہ تھیں۔ جناب مسیح کو کس قدر صعوبتوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ محض اس لئے کہ اس کی تعلیم اس وقت کے یہودیوں کو پسند نہ تھی۔ خود سالویں صدی عیسوی تک یورپ میں محض مذہبی خیالات کی بناء پر بڑے بڑے ظلم کئے گئے۔

جناب سید امیر علی صاحب نے اپنی کتاب "سپرٹ آف اسلام" میں لکھا ہے:۔

"اسکندریہ کے بازار میں مہذب دنیا کی آنکھوں کے سامنے ایک بہت نیک اور شریف خاتون کو ایک عیسائی نے ناگفتنی عذاب دے دے کر ذبح کیا۔ اور یہ عیسائی صاحب عیسائیت کی تاریخ میں ایک ولی کے خطاب سے مخاطب کئے جاتے ہیں۔" العجب ثم العجب!

ڈریپر کے صفحات بکمال صفائی ان مظالم کا ذکر کرتے ہیں جو انسانی تہذیب کے ماتھے پر تاابد کلنک کا ٹیکہ لگاتے ہیں۔ ایک حسین زیرک اور عفت مآب خاتون سکندریہ میں اپنے دارالعلوم سے باہر نکل رہی تھی کہ عیسائی پروفیسروں کے ایک گروہ نے اس پر حملہ کر دیا۔ اسے اس کی گاڑی سے گھسیٹا اور شاہراہ عام پر اسکو برہنہ کیا گیا۔ اسے ایک قریب کے گرجا میں لے جایا گیا جہاں گرجا کے پادری نے جو سینٹ کہلاتا تھا اسکو اس قدر زدوکوب کیا کہ وہ بیچاری داعی اجل کو لبیک کہہ گئی۔ اس کی لاش کو ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا۔ لیکن اب بھی ان کے غیظ و غضب کی آگ فرو نہ ہوئی۔ انہوں نے اس کی ہڈیوں سے گوشت کو نوچ نوچ کر الگ کیا اور ہڈیاں سپرد آتش کیں۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ یہ کچھ اختلاف رائے یا اختلاف عقیدہ کی بناء پر ہوا۔ یہ دردناک واقعہ سید امیر علی صاحب نے اپنی کتاب سپرٹ اسلام کی تمہید میں بیان کیا ہے۔

اس بیسویں صدی میں بھی دنیا کے بعض حصے ہیں جن میں انسانوں کو ضمیر کی آزادی حاصل نہیں۔ مثلاً افریقہ کے بعض حصص میں گورنمنٹ مشنریوں کو اپنے مذہب کی تبلیغ سے روکتی ہے۔ اور ہندوستان میں بھی ایسی ہندو ریاستیں ہیں جہاں مسلمانوں کو اپنے رسوم ادا کرنے کی اجازت نہیں نہ مسلمانوں کو وہاں اسلام کی تبلیغ کی اجازت ہے اور نہ رعیت کے لوگ اپنا مذہب تبدیل کر سکتے ہیں۔ لیکن اسلام کو یہ امتیاز خصوصی حاصل ہے کہ یہ خیالات اور تقریر کی پوری پوری آزادی دیتا ہے۔ اسلام کی کتاب یعنے قرآن مجید بآواز بلند کہتی ہے لا اکراہ فی الدین۔ دین میں کوئی جبر نہیں۔ جو دین ایک شخص چاہے اختیار کر سکتا ہے۔

پھر فرمایا قل یا ایہا الذین کفروا لا اعبد ما تعبدون ولا انتم عابدون ما اعبد

ولا انا عابد ما عبدتم ولا انتم عابدون ما اعبد لکم دینکم ولی دین - یعنی کہہ دو کہ اے کافرو میں اس کی عبادت نہیں کرتا جس کی تم عبادت کرتے ہو اور نہ تم اس کی عبادت کرتے ہو جس کی میں عبادت کرتا ہوں اور نہ میں اس کی عبادت کرنے والا ہوں جس کی تم کرتے ہو اور نہ تم اس کی عبادت کرنے والے ہو جس کی میں کرتا ہوں تمہارے لئے تمہاری جزا و سزا ہے اور میرے لئے میری جزا اور سزا (سورۃ ۱ - آیت ۲۵۶)

اور پھر دوسری جگہ فرمایا کہ "ان سے کہدو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آگیا - بس جو چاہے مانے اور جو چاہے انکار کرے"

کیا ضمیر اور خیال کی آزادی اس سے زیادہ ہو سکتی ہے ؟

یہ ضمیر کی آزادی محض زبانی لفاظی نہ تھی - جناب رسالتمآب صلعم اور آپ کے صحابہؓ اس پر بڑی سختی سے کاربند تھے - اس کے متعلق ایک واقعہ پر اکتفا کیا جاتا ہے - نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا - یہ مدینہ کا واقعہ ہے جبکہ ہمارے نبی کریمؐ سارے عرب کے بادشاہ تھے - یہ عیسائی رومن کیتھولک مذہب کے لوگ تھے - اور الوہیت مسیح کے قائل - حضرت نبی کریم صلعم اور ان عیسائیوں کے ابین گرما گرم بحث ہوئی - مسئلہ زیر بحث جناب مسیح کی الوہیت تھا - کیونکہ اسلام اور عیسائیت کے درمیان جو سب سے زیادہ اختلافی مسئلہ ہے وہ یہی ہے - یہ وفد ان مکانات میں ٹھہرا ہوا تھا جو حضرت نبی کریمؐ کی مسجد کے قریب تھے - جب وہ وہاں قیام کر رہے تھے اتوار کا دن آگیا - مدینہ میں کوئی گرجا نہیں تھا - اور وفد کے ممبر اپنی عبادت سوائے گرجا کے کہیں نہیں کر سکتے تھے - وہ اس وجہ سے پریشان خاطر ہوئے - اور نبی کریم صلعم نے ان کی حالت سے محسوس کر لیا .... کہ آپ کے مہمانوں کو تشویش ہے - حضورؐ نے ان سے پوچھا کہ کس امر کے متعلق تشویش ہے - انہوں نے جواب دیا کہ آپ جانتے ہیں کہ آج اتوار ہے ہم اپنی عبادت کرنا چاہتے ہیں مگر یہاں کوئی گرجا نہیں ہے - حضرت نبی کریم نے نہایت خندہ پیشانی سے ان سے فرمایا کہ یہ ہماری مسجد موجود ہے یہ بھی عبادت کی جگہ ہے - تم لوگ یہاں اپنی عبادت گذار سکتے ہو - اس پر عیسائیوں نے اسی مسجد کے اندر اپنی عبادت گذاری - وہ لوگ حضرت نبی کریمؐ کی فیاضی اور آپ کی عالی ظرفی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے مباہلہ سے انکار کر دیا - ان کے دل اسلام نے فتح کر لئے تھے وہ تاریخی عہد نامہ جو حضرت نبی کریم صلعم نے نجران کے عیسائیوں کو دیا ان کے جان و مال کے تحفظ اور آزادی مذہب کا ایک میگنا چارٹہ ہے جس کی رو سے ان کو وعدہ دیا گیا کہ ان کے حقوق میں کوئی فرق نہیں آئیگا - کوئی بشپ اپنے عہدہ سے موقوف نہیں کیا جائے گا اور نہ کوئی راہب اپنی خانقاہ سے اور نہ کوئی پادری اپنے عہدہ سے ہٹایا جائیگا اور ان کو چھوٹی موٹی سب مراعات حاصل ہوں گی - ان کے مجسمے اور ان کی صلیب کو .... تباہ نہیں کیا جائے گا -

اسلام کی بین الاقوامی رُوح

زمانہ حاضرہ کی ایجادات نے مواصلات اور سفر و سیاحت کے نئے ذرائع پیدا کر دیئے ہیں۔ اور دُنیا کی مختلف اور دُور دراز حصص کو آپس میں ملا دیا ہے۔ اس نے قدرتی طور پر انسان کے زاویۂ نگاہ کو وسیع کر دیا ہے۔ اور دنیا پر بین الاقوامی تعلقات کا ایک نیا دَور کھول دیا ہے۔ اس ماحول کی وجہ سے جس میں دُنیا کے سب لوگ آپس میں ربط وضبط قائم کر رہے ہیں قومی عصبیت اور خود پسندی کا جذبہ کسی قدر مدھم پڑ گیا ہے۔ اور دنیا کے لوگ بین الاقوامی امور کو مشترکہ مفاد کی اساس پر طے کرنے کی طرف میلان ظاہر کر رہے ہیں۔ لیکن اسلام نے اس بین الاقوامی رُوح کی آج سے چودہ سو برس قبل ہی تعلیم دے دی تھی اور قرآن مجید نے اُن ذرائع کو کھول کر بیان کر دیا تھا جن سے دنیا کے امور مشترکہ میں انسان صحیح صحیح فیصلوں پر پہنچ سکتا ہے۔ فرمایا :۔

یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواءٍ بیننا و بینکم۔ یعنے اے اہلِ کتاب اس امر پر آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہاں اہلِ کتاب کا لفظ بڑے وسیع معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ اور اس میں ساری دُنیا کے لوگ آجاتے ہیں۔ اگرچہ قریب ترین اشارہ اس میں یہود اور نصرانیوں کی طرف ہے۔ تاہم یہ لفظ سب پر حاوی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے زرتشتیوں کو بھی اہلِ کتاب میں شمار کیا۔ فی الجملہ اسلام نے بین الاقوامی تعلقات کا رستہ کھول دیا ہے۔ اور ایک مُسلمان مدبّر اپنے مذہب کی رُو سے دُنیا کی دُوسری اقوام کے ساتھ بین الاقوامی امور کے سلسلہ میں دستِ تعاون ...... بڑھانے کے لئے تیار ہوگا۔ مذاہب کا مطالعہ اور ان کے باہمی تعلقات پر بحث و تبصرہ جو کہ بین الاقوامی تعلقات کی رُوح کا نتیجہ ہے اور جسے زمانۂ حاضرہ کے مفکّرین کی کاوشِ ذہنی کی پیداوار سمجھا جاتا ہے وہ سب سے پہلے اسلام نے ہی مروّج کیا تھا۔ قرآن مجید نے یہود اور نصاریٰ کے اختلافات کے متعلق الفاظ ذیل میں جو بیان فرمایا ہے وہ قابلِ غور ہے :۔

وقالت النصاریٰ لیست الیھود علیٰ شیءٍ و قالت الیھود لیست النصاریٰ علیٰ شیءٍ وھم یتلون الکتٰب۔ کذٰلک قال الذین لا یعلمون مثل قولھم (سورۃ البقرہ آیت ۱۱۳)

"اور یہودی کہتے ہیں کہ عیسائی کسی سچائی پر نہیں اور عیسائی کہتے ہیں یہودی کسی سچائی پر نہیں۔ حالانکہ وہ کتاب پڑھتے ہیں۔ اسی طرح انہی کے قول کی مانند وہ لوگ کہتے ہیں جو کچھ نہیں جانتے۔"

اس طرح سے قرآن مجید تعلیم دیتا ہے کہ انسان کو دوسرے مذاہب کے اندر جو خوبیاں ہیں اُن کا انکار نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ اُن کو تسلیم کرنا چاہیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک ہر مذہب دراصل یعنے ابتداً اسی صداقت پر ہی مبنی تھا۔ اور اس لئے ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ تمام نبیوں پر ایمان لائے جو اس دُنیا میں وقتاً فوقتاً آتے

رہے۔ قرآن مجید نے یہ اصول بھی قائم کیا ہے کہ ہر قوم میں ایک نہ ایک نذیر ضرور آیا ہے۔ پس ہمارا مذہب اسلام دنیا کے تمام مذاہب کی تعظیم کی تعلیم دیتا ہے۔ اگرچہ اس کا دعوےٰ ہے کہ محض یہی مذہب خدا کے ہاں مقبول ہے۔

خلاصہ کلام

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسلامی تہذیب جن بنیادوں پر رکھی گئی ہے وہ یہ ہیں:-

(۱) فطرت انسانی

(۲) ہدایت یا الہام الٰہیہ جو تمام روشنی اور علم کا منبع ہے۔

(۳) اخوت انسانی

(۴) آزادئ ضمیر

(۵) بنی نوع انسان کا بین الاقوامی زاویہ نگاہ

ان میں سے ہر ایک امر الگ الگ بحث کا محتاج ہے جس پر کبھی آئندہ بحث کی جائے گی۔

اسلام پر معلوماتی ادب:-

نیا نظام عالم (انگریزی) NEW WORLD ORDER Rs 2/8/- — علامہ محمد علی۔ ایم اے۔ ایل۔ ایل۔ بی

اسلام اور مغربی اشتراکیت (انگریزی) ISLAM AND WESTREN SOCIALISM Rs-/10/- — مولانا آفتاب الدین احمد بی اے۔ سابق امام مسجد ووکنگ لندن

اسلام یا مارکسزم (انگریزی) ISLAM-OR-MARXISM Rs-/8/- — مولانا آفتاب الدین احمد بی اے سابق امام مسجد ووکنگ لندن

ضرورت الہام (اردو)، رازِ حیات (اردو) — خواجہ کمال الدین آف ووکنگ (لندن)

تاجر و ناشر:- ووکنگ مسلم مشن۔ عزیز منزل برانڈرتھ روڈ۔ لاہور۔ (پاکستان)

مولانا آفتاب الدین احمد صاحب

ایمان بالغیب حریت کی بنیاد

ہمارے اس دور میں مہذب انسان کے اندر ایک ذہنی رو پیدا ہوئی ہے کہ سٹیٹ (STATE) یعنی ریاست کو اس کے باشندوں کی زندگیوں پر کُلّی اختیارات دے دیئے جائیں ریاست کے مرتبہ کو TOTALITARIANISM یعنی کلیت کا نام دیا گیا ہے۔ اس خیال کا آغاز روس سے ہوا ہے اور یہ کمیونزم سے متعلق ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کمیونزم یعنی اشتمالیت میں عبوری دور کے لئے ریاست کا جو تصور پیش کیا گیا ہے وہ آمریت کا ہے جس کو دوسرے الفاظ میں کلیت بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پرولتاری یعنی نادار مزدوروں کو کُلّی خوشحالی اور آزادی کے نصب العین تک پہنچانے کے لئے کُلّی اختیارات رکھنے والی ایک ریاست کا قائم ہونا ضروری سمجھا گیا ہے۔ بالفاظِ دیگر افراد کو اپنی زندگیوں کے متعلق جو فکر لاحق ہو سکتی ہے وہ ریاست کے سپرد کر کے ریاست کے چلانیوالے جو لوگ ہیں اُن کے ہاتھ پر ایک قسم کا عہد غلامی کر لیں۔ آزادی کے اس دور میں یہ واقعی ایک عجیب رُجحان ہے مگر اس سے بھی دلچسپ جو بات ہے وہ یہ ہے کہ روسی اشتمالیت کے خلاف جو تحریکیں اس زمانے میں جا بجا پیدا ہوئیں اور جن کے ساتھ اشتمالیت کو تمدنی اور سیاسی ٹکر لینی پڑی مثلاً نازیت اور فاشیزم نے باوجود سخت اختلافات کے اشتمالیت کا یہ پہلو جو کہ ریاست کے کُلّی اختیارات سے متعلق ہے اپنے پروگرام میں شامل کر لیا۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ دریافت کیا جائے کہ اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ نوعِ انسانی کے مزاج میں کوئی بنیادی تغیر واقعہ ہو چکا ہے۔ انسان کے جذبات کی تہ میں کوئی ایسی چیز آگئی ہے جو پہلے نہیں تھی۔ پچھلی دو تین صدیوں میں مغرب میں جو سیاسی رجحان پایا جاتا تھا اور جس سے ہم مشرق کے لوگ بھی بہت متاثر تھے اور جس کے لئے ہم مغربی سیاسی خیالات کو بنظرِ تحسین دیکھتے تھے وہ یہ تھا کہ ریاست کے اختیارات کو کم سے کم کر کے افراد کی آزادئ خیال اور آزادئ عمل کو زیادہ سے زیادہ بڑھا دیا جائے مگر اب اُلٹی گنگا بہنا شروع ہو گئی ہے۔ یعنی اب یہ کوشش ہے کہ افراد کی آزادئ خیال اور آزادئ عمل کو بالکل کچل کر ریاست کو کُلّی اختیار دے دیا جائے اور قوموں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا جائے۔ قومی رجحانات میں یہ غیر متوقع تبدیلی کیوں؟ اس بات پر غور کرتے ہوئے ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ جس دور میں مغربی اقوام کے اندر آزادی کی تڑپ پائی جاتی تھی اُس زمانے میں اُن لوگوں کے اندر مذہبی

جوش کی بھی بہت فراوانی تھی۔ مگر ہمارے اس دور میں جبکہ انفرادی آزادی کو افراد اپنے ہاتھوں سے محض روٹی کی خاطر چند ہوشیار اور طاقتور لوگوں کے ہاتھ میں بیچنے کو تیار ہو گئے ہیں لوگوں کے قلوب سے مذہبی جذبہ بالکل ہٹ چکا ہے کیا اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ہونہ ہو آزادی کی تڑپ کو مذہبی جذبہ کیساتھ کوئی تعلق ہے۔

تاریخ کو پڑھنے والے اس بات کو خوب جانتے ہیں کہ مغربی اقوام .... نے قرآن کریم کے دو پیغامات کو حروب صلیبیہ کے نتیجہ میں بالواسطہ قبول کیا ہے۔ ایک پیغام وہ ہے جو سائنس کے ایجادات سے متعلق ہے اور دوسرا عمرانی زندگی کے نظم و نسق سے۔ خود مغربی مؤرخین اب اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ذہنی اور سیاسی غلامی کے خلاف یورپ میں جو احتجاج بلند ہوا تھا اور جس کے نتیجہ میں مغرب کے مختلف ممالک میں متعدد انقلابات رُونما ہوئے اس کی تہ میں قرآن کریم کا پیغام حُریت تھا۔

وہ پیغام حُریت کیا ہے؟ اس پیغام کو قرآن کریم نے ایمان بالغیب کے الفاظ میں ادا کیا ہے اور یہ اس مقدس کتاب کے آغاز میں رکھ دیا گیا ہے۔ متقی لوگ جن کے لئے قرآن کریم ہدایت لایا ہے انکی تعریف ...یہی ایمان بالغیب ہے یہ قابل غور بات ہے کہ اس موقعہ پر قرآن کریم نے ایمان باللہ کی بجائے ایمان بالغیب رکھا ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو اسی کے اندر دراصل تمام حُریت کی جڑ ہے کیونکہ ایک انسان جب اپنے آپکو اپنے ماحول یا اپنی سوسائٹی کا محتاج سمجھے اور ان ہی کے اوپر ٹیک لگا کر اپنی ہستی کو قائم رکھنے کی کوشش کرے تو وہ دراصل ماحول اور سوسائٹی کی غلامی قبول کرتا ہے۔ حُریت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اس قسم کی تمام محتاجیوں سے گذر کر اپنی ہستی اور اس کے بقا کی ذمہ داری اپنے ہاتھ میں لے لے مگر بقول قرآن کریم (خلق الانسان ضعیفًا) یعنی انسان اپنی ہستی کا اتنا بوجھ اپنے اُوپر لے کر اس کو اُٹھانے کے قابل نہیں ہے۔ وہ فطرتًا سہارے کا محتاج ہے۔ سوال صرف اتنا ہے کہ آیا وہ یہ سہارا اپنے مادی ماحول پر ڈالے اور اجتماعی زندگی پر ٹیک لگائے یا اس مادہ اور مشہود کائنات سے پرے جو غیب کی طاقت کام کر رہی ہے جس کو نوع انسانی خدا کے نام سے پکارتی ہے اس کا سہارا لے ظاہر ہے کہ اگر آزادی مقصود ہو تو حاضر دنیا سے گذر کر عالم غیب کا سہارا لینا لابدی ہے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ آج جو انسان مُدتوں کی جد و جہد سے حاصل کی ہُوئی حُریت کو اپنے ہاتھ سے اُٹھا کر چند انسانوں کے ہاتھ میں دے دینے کو تیار ہو گیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اپنی کم سمجھی سے اس نے ساری دنیا کو اہمیت دیتے ہوئے عالم غیب سے قوت حاصل کرنے کی جو اسکو عادت تھی اُسے چھوڑ دیا ہے زندگی کا بوجھ اس کو ہمت شکن معلوم ہوتا ہے اور یہ ضروری تھا کہ ایسا ہی معلوم ہو۔ مسائل ہستی واقعی بہت گراں بار ہیں انسان اپنے اندر اتنی قوت نہیں پاتا کہ اس بوجھ کو اپنے تئیں اُٹھا لے۔ باہر سے کسی نہ کسی روشنی اور طاقت کا وہ ضرور محتاج ہے اور رہے گا اس روشنی اور طاقت کو اگر وہ عالم بالا

جو کہ غیب میں ہے وہاں سے حاصل نہیں کرتا تو لا محالہ اس کے لئے اس کو اپنے ہم ثُو یا اس سے بدتر ادنیٰ مخلوق کا محتاج ہونا پڑے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ توحید کے ساتھ حرّیت کا چولی دامن کا تعلق ہے یعنی جونہی انسان نے توحید سے ہٹ کر شرک کا راستہ اختیار کیا اس کا قدم غلامی کی دلدل میں دھنستا ہوا چلا جاتا ہے گا یہی وجہ ہے کہ ہندو قوم نے جب انتہائی بُت پرستی کا راستہ اختیار کیا تو ان کا معاشرہ بھی غلامی کے انتہائی گڑھے میں غرق ہو کر رہ گیا۔

ہمیں خوف ہے کہ عیسائیت کو چھوڑ کر جو کہ پھر بھی ایک الہامی مذہب تھا عیسائیوں نے سائنس کے انکشافات سے مخمور ہو کر یہ جو مادہ پرستی کا راستہ اختیار کیا ہے اس سے ہندو قوم کی طرح غلامی کی اتھاہ گہرائیوں میں جا کر دھنس نہ جائیں اس سلسلہ میں یہ بھی خیال دل میں گذرتا ہے کہ کہیں مردم پرستی کا راستہ جو عیسائیوں نے مذھباً اختیار کیا تھا یہی ان کی موجودہ مادہ پرستی کا باعث تو نہیں ہوا۔ ہندوؤں کی قومی زندگی میں ایسا ہی ہوا تھا (اگنی وایو) وغیرہ عناصر کی پرستش سے پہلے وہ اپنے مشاہیر کی پوجا کیا کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشاہیر پرستی یا مردم پرستی شرک کے راستہ میں پہلا قدم ہے۔

خدا نے اس اُمت مرحومہ یعنی اُمت محمدیہ کو مردم پرستی سے آج تک بچائے رکھا ہے اس لئے باوجود موجودہ خستہ حالی کے اس امت سے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ مغرب کے پیچھے پڑ کر مادہ پرستی کے گناہ میں یہ مبتلا نہیں ہوگی اور اس طرح جو حرّیت کا پیغام اس نے آج سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے یورپ کو دیا تھا اور جس کی صدائے بازگشت ہمارے اٹھارویں اور انیسویں صدیوں میں مغربی تہذیب کے ساتھ پہنچی تھی۔ مغرب کے اس خطرناک تاریک دَور میں اب اس پیغام کو پوری شوکت اور جلال کے ساتھ اسکو دوبارہ دے سکی گی؟

مغرب کے مسلمان ادیب اسلام سے کیا مراد لیتے ہیں؟

(1) WESTREN AWAKENING TO ISLAM
ویسٹرن اوے کننگ ٹو اسلام Rs 3|-1-
از:- الفاروق ہیڈلے

A NEW WORLD
اے نیو ورلڈ Rs 2|8|-
از:- ولیم بشیر پکرڈ

STUDIES IN ISLAM AND CHRISTIAITY
سٹڈیز ان اسلام اینڈ کرسچینٹی Rs 2|8|-
از محمد صدیق ڈڈلے رائٹ

ناشر:- ووکنگ مسلم مشن۔ لاہور (پاکستان)

المکتوم (بی اے آنرز)

"ہندوستان میں اسلام کا مستقبل"

پاکستان کی سیاسی جدوجہد کے بعد ہندوستان میں اسلام کے متعلق نہایت یاس انگیز اندازے لگائے جا رہے ہیں۔ رجعت پسند ہندو طبقات کی کامیابی کا مطلب یہ لیا جا رہا ہے کہ اسلام ہندوستان میں اپنی ایک ہزار سالہ وراثت کو اب برقرار نہیں رکھ سکے گا۔ پاکستان کے مسلمانوں کے نزدیک ہندی مسلمان اب حیات و موت کے درمیان ہر وقت لٹکتے رہتے ہیں۔ اور جب کبھی بھی ہندوستان یا اس دیش کے باسیوں کے مابین کوئی کشمکش جنگ کی صورت میں شروع ہوئی تو ہندوستانی مسلمانوں کی بستیاں ایک دم برباد کر دی جائیں گی۔ کیونکہ ہندوستان کا حکمران طبقہ انہیں پانچواں کالم ہی تصور کرتا ہے۔

اس قسم کا ردِ عمل ہندوستان کے چند اخبارات بھی دکھا رہے ہیں۔ ان کے نزدیک ہندوؤں کا کسی اسلامی ریاست کے ماتحت زندگی بسر کرنا قطعاً ممکن نہیں اس لئے بھی پوربی پاکستان کے غیر مسلموں کو ہندوستان چلے آنا چاہیئے اور ہندوستانی مسلمانوں کو پوربی اور پچھمی علاقوں میں اپنے لئے استھان بنانے چاہئیں۔

اگر ایسا ہو تو بعض نیک دلوں کے نزدیک یہی اچھی راہ ہے۔ یہ درست ہے کہ پوربی پنجاب کی ہجرت نے مہاجرین اور شرنارتھیوں کو اتنی تلخ یادیں ذہن نشین کرا دی ہیں کہ اگر ایسی کوئی ہجرت پورے ہند اور پاکستان کے پھیلے ہوئے ملک میں جاری ہو تو اس کے نتائج ہولناک ہوں گے۔ پھر بھی ہمارے بعض نیتا اور قائد ایک دائمی امن اور شانتی کے لئے اسکو گوارا کرنے پر رضامند نظر آتے ہیں۔ ملک کے بڑے بڑے کار فرما ڈنکو چھوڑ کر جنہیں سیاسی اور جغرافیائی مصالح سامنے رکھنے ہوتے ہیں وہ لوگ جو دردمندی اور جنتا کی ہمدردی چاہتے ہیں ان کا مشورہ ان حالات میں یہی ہے۔

آئیے اسے کھنگال کر دیکھیں۔

اگر واقعی ساڑھے چار کروڑ ہندوستانی مسلمان ہندو دیش کو تیاگ دیں اور پوربی و پچھمی علاقوں میں آ کر بس جائیں تو اس کے دو نتیجے لازمی ہیں:-

اولاً یہ کہ پورا ہندوستان اسلامی افکار کی وراثت سے خالی ہو جائے گا۔ چند آثارِ قدیمہ (جیسا کہ اب پوربی پنجاب یا پچھمی پاکستان کے علاقوں میں مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں کی زیارت گاہیں ہیں) کو چھوڑ کر ہند میں اسلامی کلچر کے پروان چڑھنے اور ایک دوسرے کو متاثر کرنے کی تمام راہیں مسدود ہو جائیں گی۔ وہ لوگ جو اسلام کو انسانوں کی فلاح اور بھلائی کا ایک بلند آدرش سمجھتے ہیں ان کے نزدیک یہ صورت حال نہایت تکلیف دہ ہے۔

اسلام کے پرچارکوں نے ایک ہزار سال میں ہندیش کے قریہ اور دیہات گھوم گھوم کر اس آدرش کو پھیلایا ہے۔ معین الدین چشتیؒ، بابا فرید شکر گنجؒ، مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کوششوں اور سرگرمیوں نے ہزاروں لاکھوں انسانوں کو اسلام میں داخل کیا اور سالہاسال سے ان کی نسلیں اس دیش میں اس پیغام کے مطابق زندگی گذار رہی ہیں۔ ان کے رہن سہن نے ہندوستانی تہذیب کو کافی سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ اگر یہ لوگ ہندوستان کو چھوڑ دیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان پرچارکوں کی تمام کوششیں ایک ہزار سال کے بعد بالکل ختم ہو جائیں اور ہندوستان اسلام کی تمام تر وراثت سے بے نصیب ہو جائے۔

ثانیاً ہندوستان سے گئے ہوئے مسلمانوں کے مضبوط بلاک پوربی اور پچھمی علاقوں میں پیدا ہو جائیں۔ جن کے دلوں میں ہندوستان واپس جانے کی تمنا ہر وقت خلش پیدا کرتی رہے۔ اسی طرح خالص ہندو ہندوستان میں پراچین آریائی ذات کے حامل پوربی پچھمی علاقوں کے خلاف سخت نفرت پیدا کریں۔ ان کے دلوں میں بھی کل ہند اور پاکستان کی ایکتا رہ رہ کر کسکے۔ پھر جب بھی وقت ملے دونوں علاقے ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہو جائیں۔ گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کی تاریخ ایک مرتبہ پھر ایک ہزار برس پیچھے لوٹے۔

جہاں تک قوم پرستانہ رویے کا تعلق ہے شاید ایسی کوشش درست ہو۔ لیکن اسلام قومیت کے ایسے آبائی اور وراثتی تصور کو پسند نہیں کرتا۔ ہندوستان بر عظیم کے مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد اسی موقف سے متعلق تھی۔ اگر اسلام بھی ایک ایسا ہی آبائی دین ہوتا جیسا کہ یہودیا سناتن دھرم ہندوؤں کا مذہب ہے تو واقعی روایات اور اصنام کی حفاظت کا ایسا طریقہ صحیح بنتا۔ لیکن اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے۔ اگر اب مسلمان قوم سمٹ کر پوربی پچھمی علاقوں میں آ بسے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام کو ہندوستان میں پھیلانے کی از سر نو کوشش کی جائے۔ لیکن یہ کوشش اسلئے بھی دشوار گذار ہوگی کہ ایک مرتبہ ہندباسیوں کے دلوں میں قومی نفرت پیدا ہو جانے اور انہیں اسلامی روایات سے قرب سے بے نصیب کر دینے کے بعد اسلام کو دوبارہ ان سے قبول کرانا مشکل ہوگا۔ کیونکہ قومی نفرت توازن قائم نہیں رہنے دیتی اور مخاطب ہر مسلک کو اپنی عصبیت اور غیریت کی عینک سے ہی جانچتا ہے۔ اندریں حالات مسلمانوں کی ہندی آبادیوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہندوستان میں جمی رہیں۔ ان کا وہاں اس طرح پر بیٹھ جانا بھی اسلام کی خدمت ہوگا

کیونکہ خوف و ہراس کے زمانے میں جب کہ انہیں ظاہر پشت پناہی دکھائی نہیں دیتی محض اللہ کی برتری اور قوت پر بھروسہ کرنا خود ہندباسیوں پر حجت ہوگا۔ اور مسلمان قوم نے ایسے کئی دور دیکھے ہیں۔

اب ایک اور مشکل پیش کی جاتی ہے۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کو ان کے تمدن اور تہذیب سے بے نصیب کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور موجودہ سرکار برطانوی حاکموں کی طرح ایجابی غیر جانبدار POSITIVE IMPARTIAL نہیں بلکہ سلبی طریق سے پراچین آریائی ہندو تہذیب کی علمبردار ہے اور اپنے ہر فعل کو وید منتروں اور یگیہ سے شروع کرتی ہے۔ مسلمانوں کو اپنے علم و ادب سے دور کرنے کے لئے ان پر ایک دوسری زبان ٹھونسنا چاہتی ہے جس کے سبب مسلمان اپنی دینی وراثت سے کٹ جائیں گے۔ ماحول میں ایسی تبدیلیاں کر رہی ہے جس سے تہذیبی طور پر مسلمان دیگر اسلامی دنیا سے بے جوڑ ہو کر رہ جائیں۔

اس صورت کو محض جذبات سے نہیں دیکھنا چاہیئے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ کیا ہندی ناگری رسم الخط اختیار کرنے سے مسلمان اپنا تہذیبی اثاثہ کھو بیٹھیں گے۔ اس کے متعلق اگر ایک دوسرا سوال پوچھا جائے کہ کیا انگریزی زبان اختیار کر لینے سے مسلمان اسلام سے دور چلے گئے ہیں تو شاید بے جا نہ ہو۔ اس وقت بڑی الجھن یہ ہے کہ ہماری تہذیبی وراثت بصد وقت اب کہیں اردو میں منتقل ہوئی تھی ورنہ مسلمانوں کا بیشتر علمی سرمایہ عربی یا فارسی زبانوں میں ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں بھی یہ مشکل آن پڑی تھی۔ انگریزی چونکہ راجیہ بھاشا تھی اور اس کی تعلیم حاصل کئے بغیر سرکار تک رسائی ناممکن تھی اس لئے نوجوان پود انگریزی میں تعلیم حاصل کرتی رہی۔ اس کے برعکس علماء نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے خلاف فتاوے صادر کر دیئے۔ اس طرح ایک طرف نوجوان اور آنے والی نسلیں انگریزی کی طرف جھکتی گئیں دوسری طرف علم دین کے حامل علماء انگریزی کے خلاف فتووں کے باعث انگریزی سے برابر کٹتے چلے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علم ادب اسلامی اس پود سے دور ہوتا چلا گیا کیونکہ وہ تمام تر ایسی زبان میں تھا جو نوجوانوں کے لئے سمجھنی اور پڑھنی بیکار اور مشکل تھی۔

اب بھی اگر ایک ایسا ہی رویہ اختیار کیا جائے اور حالات کا صحیح اندازہ کئے بغیر جذبات کی رو میں ہندی ناگری رسم الخط کو اپنے لئے حرام اور غیر اسلامی مان لیا جائے تو نتیجہ انگریزی دور سے بھی کہیں خطرناک ہوگا کیونکہ انگریز تو ایجابی غیر جانبدار تھا اور موجودہ سرکار کے متعلق ایسا کہنا شاید غلط ہو۔ انگریزوں کو تو بہرحال ہندوستان کو ایک نہ ایک دن چھوڑنا ہی تھا لیکن مسلمانوں کو اب ہندوستان میں ہمیشہ زندگی بسر کرنی ہے۔ حالات سے موافقت پیدا کرنی ہے۔

سو پہلا کام جو اب مسلمان دانشوروں کے سامنے ہونا لازمی ہے وہ یہ ہے کہ ہندی ناگری رسم الخط میں زیادہ سے زیادہ اسلامی علم و ادب کو منتقل کر دیا جائے۔ ہندوستان میں زبان کا زیادہ تر رسم الخط کا جھگڑا ہے۔ اگر یہ منتقل شدہ

اسلامی علم و ادب عوامی زبان اور لوک بھاشا کے زیادہ قریب ہوا تو پھر بھی اردو بھاشا ہی کہلائے گا کیونکہ اگر اردو والوں کا موقف یہی ہے کہ یہ عوام کی زبان ہے تو فرق صرف رسم الخط کا پڑے گا۔ باقی یہ کہنا کہ ناگری رسم الخط مکمل نہیں اس بحث کی حدود سے باہر ہے کیونکہ سوال رسم الخط کے مکمل یا غیر مکمل ہونے کا نہیں حالات کے نئے میلان کا ہے اور اس وقت سرکار اس رسم الخط کو راجیہ لکھاوٹ مان چکی ہے۔ وہ اسے راجیہ اسکولوں کے ذریعہ رواج دے رہی ہے۔ عدالتوں میں بھی یہ طرز چل پڑیں گے۔ اس لئے حالات سے پنجہ آزمائی کی بہترین راہ یہی ہے کہ اسلامی علم کو اس رسم الخط میں منتقل کر دیا جائے۔ اس سے یہ ہو گا کہ نئی نسلوں کو اسلامی فکر سمجھنے میں لسی اور زبان پر مزید وقت صرف کرنے کی ضرورت نہ ہوگی اور وہ دوری جو انگریزی راج میں علماء کے غلط فتوؤں کے باعث پیدا ہو گئی تھی پھر پیدا نہ ہو گی۔ یہ اسلئے بھی ضروری ہے کہ مسلمان ابھی ابھی انگریزی راج سے آزاد ہوئے ہیں اور وہ صحیح اسلامی فکر سے شناسا نہیں اب اگر وہ ناگری یا غیر ناگری کے جھگڑے میں اُلجھ گئے تو یہ خلیج اور بھی وسیع ہو جائے گی۔

سمجھا یہ جاتا ہے کہ ہندی بھاشا کو اختیار کر لینے سے مسلمان ہند و تہذیب کی گود میں چلے جائیں گے اور اسلامی وراثت سے ان کا رشتہ کٹ جائے گا حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ اگر وہ اپنے علم و ادب کو ہندی بھاشا میں ڈھال لیں تو وہ اس طرح اپنی تہذیب کو ہندوستان کے خمیر میں سمو دیں گے۔ اور وہ تصوّر جو ہندو ذہن میں اسلام کے متعلق غیریت کا ہے کم و بیش ختم ہو جائے گا اور ہندو عوام تک اسلام کا پیغام زیادہ سرعت اور آسانی سے پہنچ سکے گا۔ اس ضمن میں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اسلام ایک متحرک قوت ہے۔ اور وہ جو حالات کے مطابق نہ ہو خود بخود مٹ جاتا ہے۔ اگر کوئی ایسی تہذیب پیدا کرنے کی کوشش کی جائے جو پراچین آریہ ورت میں ذات پات اور شودروں کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے ڈالنے سے پروان چڑھتی تھی تو وہ اب پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہندو تہذیب کا کوئی ایسا تصوّر موجود نہیں جسے متعین طور پر پیش کیا جا سکے۔ یہ خوف کہ مسلمان اس تہذیب میں دھکیل دیئے جائیں گے کم و بیش خذباتی ہے۔ قشقہ کھینچنا۔ مندروں میں گھنٹیاں بجانا۔ ناقوس کی آواز بلند کرنا اور بتوں کے سامنے سجدہ کرنا کوئی تہذیب نہیں اور اگر خطرہ یہ ہے کہ مسلمان یہ کرنے لگیں گے تو اس میں بھی مطعون ان لوگوں کو کرنا چاہیئے جو خالص اسلامی طرز فکر سے عوام الناس کو بے بہرہ رکھیں۔ ورنہ یہ سب کام تو ہندو انگریزی دور میں بھی کرتے تھے اور مسلمان اس سے الگ تھے۔ اب سرکار ایسی تو نہیں کہ وہ زبردستی مسلمانوں کو ایسا کرائے گی۔ البتہ زندگی بسر کرنے کا زاویہ نگاہ بدل جانے کا خوف ہے تو اس کا مقابلہ بھی اسی طرح ہو سکتا ہے کہ مسلمان اس میں مسابقت کریں اور ہندی رسم الخط میں اپنے علم و ادب کو ڈھال دیں۔ اس سے .... مسلمانوں کی آنیوالی نسلوں کے لئے ایک حصار بن جائے گا اور اس کے علاوہ زندگی کا آریائی نظریہ اسلامی نظریئے کی بلندی کو نہ پہنچے گا کیونکہ دونوں کا باہمی مقابلہ اب لوگوں کے سامنے ہی ہو گا۔

اسی ضمن میں ایک اور خوف پیش کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہندوستانی تاریخ میں ہندوؤں نے کسی اور طرز فکر کو پنپنے نہیں دیا۔ بدھ کی انقلابی تحریک یہاں سے مٹ گئی۔ جین مت ختم ہو گیا۔ باہر سے آئی ہوئی قوموں کا کوئی الگ وجود قائم نہیں رہا۔ اسی طرح اب اسلام اور مسلمان بھی بہ حیثیت ایک الگ نظریہ حیات اور جداگانہ قومیت قائم نہیں رہ سکیں گے۔ لیکن یہ بھی درست نہیں۔

اسلام کی جڑیں اتنی کم گہری نہیں جیسا سمجھا جا رہا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ اسلام ہندی تاریخ کے بالکل خلاف ایک ہزار سال سے اس ملک میں اپنے جھنڈے گاڑے ہوئے ہے۔ اس دوران میں کئی مرتبہ شاہی اقتدار اس کے ہاتھوں سے جاتا رہا لیکن اپنی انفرادیت کے قیام میں یہ اپنے پیشروؤں سے زیادہ سخت جان واقع ہوا ہے۔ پھر اس کی صوفیائی میراث اتنی مسلسل اور موثر ہے کہ خود ہندو دھرم کی بیشتر احیائی تحریکیں اس سے اثر قبول کئے بغیر نہیں رہ سکیں گو یہ عجیب تر ہے کہ ان احیائی تحریکوں میں اپنی اثر انداز تحریک کے خلاف سخت نفرت اور برائی پلتی جاتی ہے۔ پھر بھی یہ احیائی تحریکات اسلام کے نقوش اس دیش سے مٹانے میں ناکام رہی ہیں۔

لیکن صرف اس قدر کافی نہیں۔

اس طرح ہمیں ہندو قوم کے مزاج اور اس کے طرز کار کو ضرور دیکھنا چاہیئے۔ کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندو اپنے سے باہر کسی فکر کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اپنی قدامت کے باعث وہ اپنے تمام افکار کو بھی قدیمی مانتے ہیں اور یہ بھی چاہتے ہیں کہ نئے افکار پرانی قدروں کو چاٹ کریں بلکہ اس سرزمین کی قدامت اور عظمت کی طرح ہمیشہ قدامت کا گن گائیں۔ یہی بات تھی کہ بدھ مت باوجود انقلابی ہونے اور محدود مدت میں اتنے بڑے دیس میں پھیل جانے کے...... اپنی ماتری بھومی سے مٹ گیا اور دیس سے باہر تبت، برما، چین اور جاپان میں خوب پھلا اور پھولا۔

بات دراصل یہ ہے کہ زراعتی قومیں زمین کے معاملہ میں سخت حریص واقع ہوئی ہیں۔ لازمی طور پر زمین اور اس کے متعلقات سے ان کی وابستگیاں پرستش کی حدوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ یہود کے لئے بھی یہ بات دشوار ثابت ہوئی تھی اور ہے۔ اس زمین کے ساتھ زراعتی تعلق کا نتیجہ ہوتا ہے کہ وہ کسی اور کو اس علاقے میں داخل ہونے سے روکتی ہیں۔ یہاں ان کے اپنے ملک اور بدیشی لٹیرے کا تصور اپنی آنکھیں کھولتا ہے۔ زراعتی تعلق کے باعث وہ اپنی زمینوں کی حفاظت کو فلسفیانی بناتی ہیں۔ اسے آہستہ آہستہ تقدیس عطا کرتی ہیں۔ مطلق انسانی تعلق جو مشرق و مغرب کے انسانوں میں ہے آہستہ آہستہ کٹتا چلا جاتا ہے۔ جوں جوں کوئی زمین مقدس ہوتی جاتی ہے اتنا ہی زیادہ جذباتی رشتہ اس کے ساتھ گہرا ہوتا جاتا ہے۔ بدیشی تاراجیوں کو روکنے کے لئے آہستہ آہستہ بدیشی افکار اور رواج سے بھی نفرت ہو جاتی ہے۔

اسی طرح ہندوستان کے باسیوں نے "بھارت ماتا" کی تقدیس پیدا کی۔ اسلام کے انتراشٹریہ آدرش میں ایسی تقدیس اور پوترتا کی جگہ نہیں جو مطلق انسانی ۔۔۔۔ تعلق کو توڑ دے۔ بدقسمتی سے اس مناہی کا مطلب کسی غیر علاقے کی برتری کا قبول کرنا لیا جاتا ہے۔

اسلام کی قبولیت کے راستہ میں ایک بڑی روک یہ بھی رہی ہے کہ وہ ہردوار اور کانشی کی بجائے مکہ اور مدینہ کا تصور کیوں پیدا کرتا ہے۔ مزید برآں ہندو عوام بھی یہی سمجھتے رہے کہ یہ حکمران بدیشی ہیں، اور جب یہ مکہ اور مدینہ کا نام لیتے ہیں تو ہمارے جذباتی تعلق کو ہندوستان سے توڑ کر ہمیں غلامی کی نہ ٹوٹنے والی زنجیر ڈال رہے ہیں۔ اس طرح یہ ہماری زمینوں اور ان کے متعلقات کے حاکم بننا چاہتے ہیں۔ درحقیقت بات یہ نہ تھی۔

اسلام کسی زمین کی تقدیس اور پوترتا کا قائل نہیں۔ ہندوستان میں اسلام کے پرچارکوں کے لئے اس اُلجھن کو دُور کر دینا ضروری ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اپنی تہذیبی وراثت کو بدل دیں۔ بلکہ مقصد صرف یہ ہے کہ ہندوستان کے باسیوں کو یہ سمجھایا جائے کہ زمین کی تقدیس سے بیزاری کا مطلب کسی دوسری زمین کی پوترتا قائم کرنا نہیں اور نہ انہیں یہاں کی ملکیت اور زمین کی حکمرانی سے بے تعصب کرنا ہے۔ اب کہ دنیا ایک بہت بڑے خاندان میں یکجا ہو گئی ہے ایک ایسے تصور کا سمجھا دینا آسان ہے۔ پراچین مسلمان پرچارکوں نے جنگلوں اور صحراؤں سے بھرے ہوئے دیس، پُلوں سے خالی دریا اور درندوں سے معمور دشت پاٹ دیئے اور ہندوستانی عوام کو توحید اور انسانی برادری کا سبق دیا۔ تو اب ایسا کرنا کیسے مشکل ہے۔ پھر اب ہندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف وہ نفرت نہیں جو غلاموں کو حاکموں کے خلاف ہوتی ہے۔ ایک مدت تک خود یہ داخلیت بھی ہندو عوام کو اسلام کے قریب آنے سے منع کرتی رہی۔

ہندو عوام کو صرف یہ بتانا ہے اور اس کا احساس کرانا ہے کہ اسلام ان کا اپنا دین ہے اور محمد رسول اللہ ہی ان کے دردمند رہبر ہیں۔ اسلام ایک انسانیت پسند سماج کا حامی ہے اور خود اسی کے لئے کوشاں ہے اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اس سے صرف وہ باتیں ترک کرنا ہوں گی جو انسانیت پسندی میں روک ہیں۔ اسلام اصول ہے۔ اور اصول ہر ایک کا اثاثہ ہے۔

چنداں عجیب نہیں کہ ہندوستان کی موجودہ یاس انگیز تاریکی میں اسلام کا وہ خورشید طلوع ہو جو آج تک حکومت اور وجاہت کی بدلیوں میں ڈھکا رہا۔ اور آیندہ سو سال اسلام کو ہندوستان کا غالب دین دیکھیں:۔

اور تم کوئی حزن یا ملال نہ کرو کیونکہ تم ہی تو کامران ہو گے۔
اگر تم مومن ہو۔ (القرآن)

"رجحانات"

اسٹار نیوز سروس نے مصر کے حالیہ انتخابات کے بعد وفد پارٹی کی کامیابی کا تذکرہ کیا۔ اسی ذیل میں طٰہٰ حسین بے، جو وزارت معارفِ مصر (EDUCATION MINISTRY) کے رئیس مقرر ہوئے ہیں کا بھی ذکر کیا ہے طٰہٰ حسین بے پیدائشی اندھے ہیں۔ ازہر یونیورسٹی سے انہوں نے اپنی تعلیمی سند حاصل کی۔ مانچسٹر گارڈین نے اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"مصر میں سماجی ناہمواری کے متعلق چند ٹھوس اور صحیح باتیں کہی جاتی ہیں لیکن یہ امر اس ملک کے لئے باعث فخر ہے کہ ایک نادار اور غریب لڑکا جس کی راہیں اس کے پیدائشی اندھے پن نے مسدود کر رکھی تھیں، اپنی ذاتی کوششوں سے ریاست کے چند انتہائی بڑے مقامات میں سے ایک تک پہنچ گیا"

مندرجہ تنقید کسی مزید حاشیے کی محتاج نہیں۔ کہنے کو اسلام یورپ کے نزدیک جہالت اور رجعت پسندی ہے لیکن شاید ایک پیدائشی اندھا کسی بھی ملک کے نوجوانوں اور اطفال کی تربیت و تعلیم کے لئے اتنے کلیدی مقام پر آج تک تعینات نہیں ہوا۔

رائٹر کا نمائندہ قاہرہ سے ایک اطلاع دیتا ہے:۔

"دو لاکھ کے قریب پراچین قبائلی ملحد جو بالائی نیل کے صوبہ جات اور حبشہ کے ساتھ ساتھ جنوبی سوڈان کے صوبہ فنگ تک آباد ہیں اسلام میں عنقریب شامل ہو جائیں گے۔ یاد رہے کہ اسلام کو اس علاقہ میں داخل ہونے سے قانونی طور پر روکے رکھا گیا ہے۔ پچھلے چالیس سال میں پہلی مرتبہ، دس مسلمانوں کو برطانوی حکام سے اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ ان قبائلیوں

کو عربی زبان پڑھائیں - یہ اجازت دراصل سوڈانی حکومت
کے اُس فیصلہ کا نتیجہ ہے جس میں عربی ریاست کی زبان تسلیم
کی گئی ہے اور ملک بھر میں اسے رائج کرنے کے لئے کوشش
شروع ہو گئی ہے۔

سنہ ۱۸۹۸ء سے لے کر جب برطانیہ نے سوڈان کو اپنے
قبضہ میں لیا ہے۔ برطانوی، امریکی اور اطالوی عیسائی مبلغوں
نے ان قبائلیوں کے درمیان عیسائیت کے پرچار کی سرتوڑ کوشش
کی ہے اور اس جد وجہد میں انہیں خاصی کامیابی بھی ہوئی -

بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں چند مسلمانوں نے اس
علاقے کا دورہ کیا اور تھوڑے سے عرصہ میں ہزاروں قبائلیوں
نے اسلام قبول کر لیا - قبائلیوں کے درمیان اسلام کی قبولیت کا
یہ منظر دیکھ کر عیسائی منادوں نے برطانوی حاکموں کے ہاں شکایت
دی کہ وہ مسلمانوں کا داخلہ اس خطہ میں بند کر دے - اس درخواست
کے نتیجہ میں سنہ ۱۹۱۰ء سے مسلمانوں کا داخلہ اس علاقے میں ممنوع
قرار دیا گیا۔ مسلمان قبائلیوں کو عیسائیت قبول کرنے پر مجبور کیا گیا
اور جس نے اسلام سے وفا کی اُسے منظم طریق پر صاف کر دیا گیا -
باقیوں کو کھلے بندوں نماز کی ممانعت کر دی گئی البتہ سنہ ۱۹۳۶ء میں
انہیں ایک مسجد بنانے کی اجازت ہوئی -"

اس خبر میں کس حد تک صداقت ہے اس کے متعلق کچھ کہا نہیں جا سکتا - البتہ اس قدر ضرور ہے کہ برطانوی حکام جو ہندوستان میں ذرا فیاض واقع ہوئے تھے تاریک براعظم کے معاملہ میں بہت ہی تنگ نظر دکھائی دیتے ہیں۔ خبر کا یہ حصہ جو سنہ ۱۹۱۰ء کی ممانعت سے متعلق ہے تاریخی ہے - قبائلی اب آمادہ اسلام ہوں یا نہ ہوں یہ امر دیگر ہے اسلام کی ابھرتی ہوئی لہر کی روک تھام قانون کے ذریعے عجیب تر ہے - اسلام پچھلی صدی میں حکومتی پشت پناہی کھو چکا تھا اور عیسائی مبلغ تو زیورِ علم وتہذیب سے شناسا تھے۔ پھر یہ عجیب نہیں کہ جاہل مسلمانوں نے عالم عیسائی منادوں کے لئے ایک دشوار ترین اُلجھن پیدا کر دی -

اگر سادگی کا پاس ہو اور حق ترسی مقصود تو اسلام کی راہ بڑی سریع الفہم ہے اسی لئے تو ملحد قبائلیوں کے لئے

خدا کا تصوّر رہا اور عام انسانوں کی ایکتا کا سمجھنا آسان ہوا اور تین خداؤں کا غیر تقلیدی تصوّر توحید ان کے لئے مشکل بن گیا۔ مگر یورپ کے علم پرور حلقے بہت عرصہ تک ایسے بند لگا کر انسانوں کو ان کے اپنے فطرتی دین اسلام اور ہمدرد رہبر محمد رسول اللہ سے دور نہیں رکھ سکتے۔ کیونکہ یورپ کے لئے اب تو وہ فلاح کی راہ محمد رسول اللہ کا لایا ہوا دین ہی ہے۔

روزنامہ "سفینہ" لاہور نے ڈان کے لندنی نامہ نگار مسٹر فرید جعفری اور نوائے وقت کے نامہ نگار علی اختر مرزا کی دو مختلف خبروں کو جو ان دونوں روزناموں میں چھپ چکی ہیں بدیں الفاظ نقل کیا ہے اور اس پر ایک ادارتی نوٹ لکھا ہے:-

"پاکستان کے بڑے یا تمام بڑے اخباروں نے لندن میں اپنے نامہ نگار مقرر کر رکھے ہیں۔ ان میں دو اخباروں کے نامہ نگاروں کے کمالات صحافت کی داد دیجئے۔ ڈان کے لندنی نامہ نگار نے مندرجہ ذیل خبر بھیجی اور اسے ڈان نے تبرک سمجھ کر شائع کیا۔

جمعہ کو بیگم رحمت اللہ اور ہائی کمشنر نے پاکستان کے گشتی سفیر گورمانی صاحب کا پاکستان ہوس میں خیر مقدم کیا۔ خیر مقدم اس جگہ کیا گیا جہاں بالعموم جمعہ کی نماز ہوتی ہے اور جس میں ہائی کمشنر صاحب باقاعدگی سے شرکت کرتے ہیں اس دن بھی چند گھنٹے قبل وہاں حسب معمول نماز جمعہ ادا کی گئی تھی اس جگہ جہاں عموماً نماز جمعہ ادا کی جاتی ہے۔ دیواروں کو قرآن پاک کے طغروں سے مزین کیا گیا ہے اور جہاں چند گھنٹہ قبل نماز ادا کی جا چکی تھی وہاں نواب گورمانی کے اعزاز میں شراب پی گئی اور مہمانوں کو پلائی گئی۔

یہ تو تھا انگریزی اخبار کے لندنی نامہ نگار کا کارنامہ اب ذرا اردو اخبار نوائے وقت کے لندنی نامہ نگار کا شاہکار بھی ملاحظہ فرمایئے۔ ارشاد ہوتا ہے:-

"مس رابعہ سلطان قاری جو لندن میں سرکاری خرچ پر اعلیٰ تعلیم کے لئے آئی ہوئی ہیں ایک دوکان سے ساٹن کا تھان چرانے کے الزام میں پکڑی گئیں، عدالت نے ان پر بیس پونڈ جرمانہ کیا اور پانچ پونڈ پانچ شلنگ عدالت کا خرچہ بھی ان پر ڈال دیا۔ جو تھان چرایا گیا تھا اس کی قیمت ۳۸ شلنگ تھی۔

ڈان اور .... نوائے وقت کے نامہ نگار .... دونوں تجربہ کار صحافی ہیں ان دونوں کے کارنامے ایسے ہیں کہ ان سے پاکستان کی صحافت اور خود پاکستان کا سر افتخار بھی دنیا بھر میں بلند ہو گیا ہے۔

پاکستان کے بڑے شرابی اور چھوٹے چور ہا زندہ باد۔ لندنی نامہ نگار زندہ باد۔"

معاصر "سفینہ" نے جو نوٹ اس پر لکھا ہے اس میں عتاب تمامتر غریب نامہ نگاروں پر ہے۔ ان کا قصور یہ ہے کہ انہوں نے ایسی خبر کیوں بھیجی۔ ڈان کا دوش یہ ہے کہ اس نے اسے تبرک سمجھ کر شائع کیا ہے اور یہ عتاب اس لئے ہے کہ ان دونوں کے "کارناموں" سے پاکستان کی صحافت اور خود پاکستان کا سر افتخار بھی "دنیا بھر میں بلند ہو گیا ہے"۔

ہم نہیں کہہ سکتے معاصر سفینہ نے کس مصلحت کے تحت ان نامہ نگاروں سے ایسی خبروں کے روک لینے کی بین السطور خواہش ظاہر کی ہے۔ لیکن یہ خبریں ایک مکروہ حقیقت کی نقاب کشائی ضرور کرتی ہیں کبھی کوئی انقلاب خالی خولی باتوں سے پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہی اسلام کوئی ایک بنا بنایا ڈھانچہ ہے جو حکومت کے توسط ایک قوم پر چڑھایا جا سکتا ہو، پاکستان کے متعلق یہی سمجھا جاتا تھا کہ یہ مسلم قوم کی کج روی کو دور کر دے گا کیونکہ ہماری سماجی تعمیر میں بدیشی سامراج حائل ہے۔ نواب مشتاق گورمانی اور ان کے دیگر ساتھی اسلام کے اچھے "علماء" میں سے ہیں انہیں اس دین کی وکالت کرنی بھی خوب آتی ہے۔ لیکن خود اس دین کے روندتے ہیں صرف اتنا ہی کافی معلوم ہوا کہ وہ اس دیس کے عوام کی نظروں سے اوجھل ہیں جنہیں وہ دن رات اسلام کی نشاۃ الثانیہ کا حسین خواب دکھاتے رہتے ہیں۔ یہ کارفرما شاید احتساب خداوندی کی نسبت احتساب قومی سے زیادہ ڈرتے ہیں۔ اور آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل کی مصداق پاکستان سے دور ہر قسم کی غیر اسلامی حرکت کو حلال و مباح سمجھ لیتے ہیں۔ آج تک۔

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے

سنتے آئے تھے۔ لیکن پاکستان کی خالص اسلامی ریاست جو قرار داد مقاصد پاس کر کے کلمہ بھی پڑھ چکی ہے کے "اول المومنان" اسے سب سے پہلے عین "منبر مسجد" پر پورا کر رہے ہیں۔ اس میں کسی سائے کو بھی تو انہیں رکھا۔

اسلام ناقابل عمل ہے!

اسلام مشکل ہے!!

اسلام تنگ نظر، اُلجھا ہوا، اور کئی ایک تشریحات میں بٹا ہوا ہے!!!

یہ سب مان لیا

مگر آپ نے کبھی اسے سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے۔؟

جذباتی نعروں اور سطحی طرز فکر کو چھوڑ دیں

شعبۂ مراسلات ماہنامہ "اشاعت اسلام" اِس اُلجھاؤ میں سے نکلنے میں آپ کی مدد کرے گا۔

نسائیات

محترمہ نیر بانو

گھریلو زندگی کا مسئلہ

ہمارے خانگی نظام کے بگاڑ میں جس چیز کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے۔ وہ دینی رُوح کا فقدان ہے۔ جس طرح ایک تندرست اور خوشنما جسم صحت کے رخصت ہو جانے کے بعد ایک کمزور اور مریل جسد کی شکل اختیار کر لیتا ہے جسے ہر بیماری بڑی جلدی زیر کر لیتی ہے۔ اسی طرح جب ہمارے خانگی نظام سے دین کی رُوح نکل گئی تو آہستہ آہستہ بیشمار مفاسد نے اس میں گھس بیٹھنے کے لئے راہ پالی۔ زندگی مزرعۃ الآخرۃ ہونے کی جگہ خود منزل مقصود بن بیٹھی۔ اور مردوں اور عورتوں کو نہ اپنے حقوق کی حدود یاد رہیں اور نہ اپنے فرائض کی۔

مرد اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ "درجۃ" کی کیفیتوں میں ایسے کھوئے گئے کہ انہیں یہ بات یاد ہی نہ رہی کہ انہیں عورتوں کے حقوق ادا کرنے اور ان سے حسن سلوک کرنے کی کتنی ہدایت کی گئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مطلق العنان حکمران ہو کر ظلم وستم ڈھانے لگے اور اس طرز عمل نے ایک طرف تو خانگی نظام میں رنج و غم کا اضافہ کیا اور دوسری طرف دشمنان اسلام کو اس بات کا موقع بہم پہنچایا کہ وہ عورتوں کی ہمدردی و غمگساری کے پردے میں انہیں مردوں سے اور ساتھ ہی اس مذہب سے بھی برگشتہ کر دیں جس کی آڑ لیکر مرد ظلم وستم توڑ رہے ہیں۔ عورتوں کو مسلمٰت، قٰنتٰت، تٰئبٰت، عٰبدٰت بننے کی کوئی تمنا ہی نہ رہی۔ اور نہ انہیں یاد رہا کہ وہ خاوند کے گھر میں ایک راعیہ کی حیثیت رکھتی ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود عورتوں کے ہاتھوں گھروں میں ایسی ایسی بدعتیں گھس آئیں جو اسلام اور ایمان کے خلاف تھیں اور اغیار کو اس بات کا احساس ہی نہ رہا کہ وہ کسی کے آگے جوابدہ بھی ہیں۔ والدین نے اولاد کو اللہ کی امانت سمجھنے کی جگہ اپنی شئے سمجھنا شروع کر دیا۔ چنانچہ ان کی پرورش کرتے ہوئے اس بات کا خیال نہ رکھا گیا کہ وہ اللہ کے سپاہی بنیں بلکہ یہ پیش نظر رہا کہ یہ دنیاوی عزت کے مالک ہوں اور ہمارے کام آئیں۔ اس طرز عمل کا نتیجہ اکثر یہی ہوا کہ والدین نے جوانی تو بچوں کی دنیاوی بہتری کے لئے صرف کر دی اور بڑھاپا ان کی غیر متوقع بدسلوکی کا رونا روتے گذار دیا۔ اور ان کی زندگی سراپا زیان و خسران ہو کر رہ گئی اعزہ و اقارب کو یاد ہی نہ رہا کہ اسلام نے رشتہ داروں کے کیا حقوق قائم کئے ہیں اور صلہ رحمی کو کیا حیثیت دی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بے تکلف ایک دوسرے کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے لگے اور انہوں نے اپنی اپنی خیالی

مظلومی کو وجہ جواز بنا کر ایک دوسرے سے ایسی ایسی گھناؤنی بے انصافیاں کیں کہ قرابت داری لطف و محبت کا وسیلہ بننے کی جگہ دشمنی اور عداوت کا نشان ہو کر رہ گئی۔ غرضیکہ خانگی نظام سے دینی رُوح نکل جانے کے باعث اس میں جہالت و جمود و ظلم و ستم رنج و غم اور بے چینی اور اضطراب پھیل گیا اور وہ ملک و ملت کے لئے مفید ثابت ہونے کی جگہ اُلٹا مضر ثابت ہونے لگا۔ اور اب جب تک اس میں از سر نو اسی دینی رُوح کو جاری و ساری نہ کیا جائے گا اسلامی نقطہ نگاہ سے اس کے مفید ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ چاہے اس کی اصلاح و ترقی کے لئے کتنی بھی کوششیں کیوں نہ کر ڈالی جائیں اور چاہے خواتین گھروں میں بیٹھنے کو کتنا ہی لازم کیوں نہ پکڑ لیں۔

علم دین سے بے پروائی

خانگی نظام میں دینی رُوح کو پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ خواتین میں علم دین کو عام کیا جائے۔ اور وہ قرآن و حدیث سے اچھی طرح روشناسی حاصل کریں۔ اس نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو عورتوں کی حالت بہت ہی افسوسناک ہے۔ قرآن تو خیر بغیر سوچے سمجھے پڑھ بھی لیا جاتا ہے۔ مگر حدیث کے متعلق خواتین کی جہالت اس درجے کو پہنچی ہوئی ہے کہ ان کی کثیر تعداد لفظ حدیث کا سرے سے مطلب ہی نہیں جانتی حدیث وہ شئے ہے کہ اس کی بدولت حضور صلعم کی پوری زندگی روز روشن کی طرح واضح ہو کر ہمارے سامنے آگئی ہے۔ اور ہمارے لئے یہ بڑا آسان ہو گیا ہے کہ ہم حضور صلعم کی زندگی کے ہر پہلو کے متعلق معلومات بہم پہنچائیں اور اپنی زندگیوں کو اس اسوہ حسنہ کے مطابق ڈھالنے کی کوششوں میں مصروف رہ کر سعادت دارین حاصل کر سکیں۔ حدیث کی اس افادیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس غفلت کی طرف دھیان کیجئے جو حدیث کی طرف سے برتی جاتی ہے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ غفلت ہمیں کتنی مہنگی پڑ رہی ہے۔ پھر قرآن پڑھنے کا جو ڈھنگ ہمارے ہاں رائج ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قرآن جس مقصد کے لئے نازل ہوا تھا وہ بالکل پورا نہیں ہوتا۔ اللہ تعالے نے جو ہمیں مقدس کتاب دی تھی تو صرف اس لئے تو نہیں دی تھی کہ ہم عزت سے اُسے کسی اونچی جگہ رکھ دیں اور کبھی کبھار بے سوچے سمجھے پڑھ ڈالیں۔ بلکہ اسے عطا کرنے کا اصل مقصد یہ تھا کہ ہم سوچ سمجھ کر اس کی تلاوت کریں اور اس کے احکام پر عمل کریں۔ اب جب ہم ان احکام کو سمجھیں گے ہی نہیں تو آخر عمل کیسے کریں گے۔ اس سے آپ سمجھ سکتی ہیں کہ قرآن و حدیث کو سمجھ کر پڑھنا کتنا ضروری ہے۔ اور اس سے غفلت برت کر ہم کس طرح اس بات کو دعوت دے رہے ہیں کہ پرانی اور نئی جاہلیت کے گمراہانہ افکار آئیں اور بے تکلف ہمارے دماغوں میں گھس بیٹھیں اور دلوں پر قبضہ جمالیں۔

عذرات

دین کا علم حاصل کرنے کے لئے عموماً دو بہانے پیش کئے جاتے ہیں۔ ایک تو وہی "بہانہ عوام" یعنی وقت نہیں ملتا اور دوسرا یہ کہ سکھانے والے نہیں ملتے جہاں تک اول الذکر عذر کا تعلق ہے اس بات کو یاد رکھنا چاہیئے کہ وقت اسی

کام کے لئے نہیں ملتا جسے ضروری خیال نہ کیا جائے جس کام کو انسان ضروری سمجھ لے اس کے لئے وہ کوشش کر کے بھی وقت نکال ہی لیتا ہے۔ ذرا کھانے اور سونے ہی کے معاملات کو لیجئے۔ کسی مصروف سے مصروف انسان کے لئے بھی یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی مصروفیتوں کے پیش نظر ہفتوں بغیر کھائے، بغیر سوئے کام کرتا چلا جائے، کیونکہ وہ خوب جانتا ہے کہ ان دونوں چیزوں کو ترک کروں گا تو موت یا بیماری یقینی ہے۔ اس لئے چاہے اسے کاموں نے کیسا ہی کیوں نہ نرغے میں لے رکھا ہو وہ کھانے اور سونے کے لئے وقت نکال ہی لیتا ہے۔ اسی طرح اگر ہم اس بات پر بھی دل سے یقین رکھتے ہوں کہ دین کا علم حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ اگر ہم اس سے غفلت برتیں گے تو ہمیں دنیا میں رہنے کا صحیح ڈھنگ ہی نہ آئے گا۔ اور دُنیا میں غلط طریق سے زندگی بسر کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا اور عاقبت دونوں برباد ہوں گی تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم علم دین حاصل کرنے کے لئے وقت نہ نکال سکیں۔ اپنی مصروف بہنوں کی خدمت میں گذارش ہے کہ وہ کسی شب اپنے دن بھر کے کاموں کو ذہن میں تازہ کریں اور پھر ایک ایک کام کو باری باری حصول علم دین کے مقابلے میں رکھ کر ٹھنڈے دل سے اس بات پر غور کریں کہ ان میں سے کس کی افادیت زیادہ ہے۔ اس طرح دن بھر کے سب کاموں کو بنظر تنقید دیکھنے کے بعد انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ان کاموں میں سے جنہیں وہ بڑا ضروری خیال کرتی ہیں کئی ایسے ہیں جن کی افادیت حصول علم دین کی افادیت کے آگے کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ اب اگر انہوں نے اپنا وقت نسبتاً کم مفید کاموں پر صرف کر دیا اور حصول علم دین جیسے بے پناہ افادیت رکھنے والے طریقے سے غفلت برتی تو خیال کیجئے کہ انہوں نے کیسی زیاں پسندی کا ثبوت دیا۔ پھر اس صورت میں ان کے اس عذر میں کہ "وقت نہیں ملتا" کیا جان رہ جاتی ہے؟ وقت تو ملتا ہے۔ مگر اسے نسبتاً کم اہم کاموں پر صرف کر دیا جاتا ہے اور اہم کام بن کئے پڑا رہتا ہے۔

اب باقی رہا یہ عذر کہ سکھانے والے نہیں ملتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ عذر اوّل الذکر عذر کی نسبت زیادہ معقول ہے۔ مگر اسے نسبتاً معقول مان لینے کا یہ مطلب نہیں کہ اسے بڑا معقول مانا جا رہا ہے، کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ علم دین سکھانے والوں کے نہ ملنے کی وجہ بھی بڑی حد تک ہماری اپنی علمی بدشوقی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ صحیح معنوں میں علماء دین کم ہیں مگر ان کی تلاش کرنے والے اور ان سے کسب فیض کی خواہش رکھنے والے کون سے زیادہ ہیں خواتین میں علم دین حاصل کرنے کا اوّل تو شوق ہی پیدا نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو پھر وہ اس شوق کو پورا کرنے کا بندوبست کرنے کے لئے کوئی غیر معمولی جد و جہد کرنے کی طرف دھیان نہیں دیتیں۔ اور اس راہ میں دشواریاں دیکھ کر ہمت ہار بیٹھتی ہیں، یہ بڑی بے نصیبی کی بات ہے اور اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ علم دین کو وہ اہمیت نہیں دی جا رہی جو اسے دی جانی چاہیئے تبھی تو اس کے حصول کے لئے کوئی غیر معمولی سعی نہیں کی جا رہی۔ سکھانے والوں کے نہ ملنے کا عذر پیش کرنے سے پہلے ہماری بہنوں کو ٹھنڈے دل سے اس بات پر غور کر لینا چاہیئے کہ کیا واقعی وہ حصول علم کا کوئی بندوبست کرنے کے لئے امکان بھر کوششیں کر بیٹھی ہیں۔ اور پھر اگر انہوں نے اس راہ میں کوئی غیر معمولی سعی کی نہیں

تو یہ عذر پیش کرنا فضول ہے کہ سکھانے والے نہیں ملتے۔ اگر سکھانے والے نہیں ملتے تو آپ انہیں ڈھونڈھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں؟ اصل دقت یہ نہیں کہ سکھانے والے نہیں ہیں بلکہ یہ ہے کہ سیکھنے والوں کے دلوں میں شوق نہیں ہے۔ اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ جن محلوں میں قرآن وحدیث کے درس کا انتظام موجود ہے۔ وہاں بھی فیض اُٹھانے والوں میں زیادہ تر مرد ہی ہوتے ہیں حالانکہ خواتین ذراسی جدوجہد کرکے مساجد میں اپنے لئے پردے کا انتظام کروا کر کسب کر سکتی ہیں۔ اب خیال فرمایئے کہ ایسے علاقوں کی عورتوں کے پاس کلام پاک کے احکام سے جاہل رہ جانے کے لئے کیا عذر ہو سکتا ہے۔ اور اسی طرح ان خواتین کی جہالت کے لئے کیا وجہ جواز ہے جن کے قریبی عزیزوں میں ایسے مرد موجود ہیں جو انہیں علوم دینیہ سے روشناس کرا سکتے ہیں۔

ایک نادانی کی بات

یہ کتنی نادانی کی بات ہے کہ جب انسان کے جسم کو کوئی عارضہ لاحق ہو جائے تو وہ تڑپ اُٹھے اور ڈاکٹروں اور حکیموں کی تلاش میں شہر شہر کی خاک چھانتا پھرے اور اگر پیسے پاس نہ ہوں تو قرض دام لیکر بھی اپنا علاج کرائے اور اپنی صحت کی بحالی کے لئے اپنے اہم ترین کاموں کو بھی نظرانداز کر دے مگر جب اس کی روح ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ رہی ہو تو اس کے کان پر جُوں تک نہ رینگے اور وہ زبان حال سے بڑی شان بے نیازی سے فرمادے کہ ہاں مرتی ہے تو مرجا کہ میرے پاس پکانے اور ڈھونے اور دھونے دھلانے سے یا سیر وتفریح کرنے اور سینما بینی سے اتنی فرصت نہیں کہ تیری دیکھ بھال کروں اور نہ میرے مکان کے پاس کوئی روحانی طبیب رہتا ہے جس سے جلدی سے تیرے لئے نسخہ بندھوا لاؤں۔ تو قیمتی چیز سہی مگر اتنی قیمتی نہیں کہ تیری خاطر میں مذکورہ بالا مصروفیات کو نظرانداز کر دوں اور کسی روحانی طبیب کی تلاش میں ماری ماری پھروں۔

ان بے نیازیوں اور عذر طرازیوں کا انجام وہی ہو گا جو ہونا چاہیئے یعنی خواتین میں علم دین عام نہ ہو سکے گا۔ اور بغیر اس علم کے حاصل کئے انکے لئے یہ بے انتہا مشکل ہو گا کہ وہ بدلے ہوئے حالات کے تقاضوں کو سمجھ ہی سکیں۔ اگر انہیں اپنی آنکھیں نہ ملیں تو اسکے سوا کیا ہو گا کہ یا تو وہ ٹٹول ٹٹول کر چلیں گے یا مردوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر قدم بڑھائیں گی۔ اور ایسا کرنیکا نتیجہ یہی نظر آتا ہے کہ یا تو وہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں گی یا ذرا ذراسی بات پر مردوں کا سہارا ڈھونڈیں گی اور ان میں سے کوئی بات بھی ایک ایسی امت کی خواتین کے شایان شان نظر نہیں آتی۔ جو دُنیا میں اقوام عالم کی امام بن کر آئی ہو اور اپنی اصل حیثیت کو حاصل کرنے کیلئے جدوجہد کی منازل میں داخل ہو چکی

سب سے پہلا کام

اگر ہم چاہتے ہیں کہ اپنے خانگی نظام کو اسلام کی بنیادوں پر قائم کریں، اور ایک ایسی صالح نسل تیار کر سکیں جو احیائے اسلام کے آغاز کردہ کام کو آگے چلا سکنے کی صلاحیتیں رکھتی ہو تو پہلا کام یہ ہے کہ گھریلو فضا میں دینی رُوح کو جاری وساری کیا جائے اور یہ تب ہی جاری ہو گی جب علم دین عام کیا جائیگا۔ فی زمانہ حصول علم دین میں بیشمار دقتیں سہی مگر یہ نہ بھولئے کہ سب سے بڑی دقت یہی ہے کہ دلوں میں لگن باقی نہیں رہی دلوں میں لگن پیدا کیجئے تو آپ سب سے بڑی دقت پر قابو پالیں گی۔

از:- م-احمد - ایم اے (علیگ)

شاعر مشرق

نسلِ انسانی کے ارتقاء میں پیغمبر، مصلح، فلسفی، شاعر، مبلغ و مورّخ بہت اہم کردار ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا ایک خاص مقام ہے اور تاریخ انسانی کو صحیح طور سے مرتب کرنے کیلئے ضروری ہے کہ یہ اہم کردار اپنے صحیح مقام کے ساتھ درج کئے جائیں۔ ان کی ایک سلیس اور واضح تعریف کرنی ضروری معلوم ہوتی ہے کیونکہ علماء انہیں چار مقامات میں سے اقبال مرحوم کو جگہ دینے کی کاوش کرتے ہیں۔ ایسی واضح تعریف کے بعد پھر منطقی طور سے خود ہی اقبال کا مقام نظر آسکتا ہے۔

پیغمبر ارتقاء نسل انسانی کی نشو ونما کے لئے حکمتِ نظری و حکمت عملی کا متوازن امتزاج اور عملی ظہور لازمی ضروری ہے بلکہ ایک بنیادی حیثیت رکھتے ہیں جب بھی یہ توازن بگڑ جاتا ہے تو انسانی معاشرہ ایک بحران کا شکار ہوتا ہے۔ تمدن انسانی کی ناؤ ڈوبنے کو نظر آتی ہے تب کوئی عظیم المرتبت شخصیت ایک نئی حکمت نظری و حکمت عملی کا اظہار اپنے وجود میں کرتی ہے اور پورے وجود کے ذرہ ذرہ سے اس کی شہادت دیتی ہے۔ خونِ جگر سے اس کی آبیاری کرتی ہے جس سے اس میں ایک زبردست قوتِ نفوذ پیدا ہوتی ہے مستعد طبائع اس سے متاثر ہوتے ہیں اور اسکو محور بنا کر ایک عالم کو متاثر کرکے ایک نئی زمین اور نئے آسمان کو پیدا کر کے نئے نظام کی بنیاد ڈالتے ہیں۔ یہی وہ نئی قوم ہوتی ہے جس کی ہر حرکت میں۔ ہر قول میں حتی کہ اس کی سانس میں بھی ایک پیغام مضمر ہوتا ہے۔

اس قوم کا محور یعنی وہ پیغمبر خود ایک ربوبیت ایک رحمانیت ایک رحیمیت اور ایک خالقیت کی صفت کا مالک ہوتا ہے۔ انسانی کمزور استعداد نے بہت دفعہ ایسی شخصیت کو خدا۔ خدا کا حلول یا خدا کا بیٹا بنا کر تاریخ انسانی کے چمکتے ہوئے نگینہ کو بے ڈھب بنادیا مگر محمد رسول اللہ صلعم کے ظہور نے اس کمزوری کے خلاف ایسی زبردست بغاوت کی کہ ہمیشہ کے لئے اس غلطی کا ازالہ ہوگیا اور تاریخ انسانی پر ایک احسان کیا۔ قوم محمد صلعم نے اپنے اس عظیم الشان پیغمبر سے عشق کرنے میں ہر قوم سے سبقت کی مگر کبھی خدا یا خدا کا حلول یا بیٹا نہ بنایا۔ رسول اور عبد کا مقام بھی اس لئے دیا کہ وہ آپ کے دعوے میں واضح الفاظ میں موجود تھا۔

مصلح۔ اہمیت کے لحاظ سے پیغمبر کے بعد دوسرا مقام مصلح کا ہے۔ عربی زبان میں اسکو مجدد بھی کہتے ہیں۔ مصلح بھی

بعینہٖ پیغمبر کی طرح حکمت نظری و حکمت عملی کا ظہور ہوتا ہے۔ پیغمبر و مصلح کے لئے ہی قرآن کریم نے فرمایا:- "و یعلمھم الکتاب والحکمۃ" اور حکمت میں حکمت نظری و عملی دونوں داخل ہیں۔ مصلح بھی ایک نئی قوم پیدا کرتا ہے۔ مگر مصلح کی بنیاد پیغمبر میں ہوتی ہے۔ وہ پیغمبر کا بروز ہوتا ہے۔ وہ اسی پیغام کو جدید نفوذ کے ساتھ لاتا ہے۔ وہ اسی ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت اور خالقیت کو نئی زمین میں استعمال کرتا ہے۔ وہ قومیت کی حدود بدل سکتا ہے اور بضرورت بدل بھی دیتا ہے مگر پیغام میں سر مو ردّ و بدل نہیں کرتا۔ اگر پرانی قوم اسکو رد بھی کر دے تو بھی وہ پیغمبر سے الگ کوئی محور نہیں بناتا بلکہ اسکو رد کرنے والا ہی اصلی محور سے کٹ جاتا ہے۔ اگر تقاضائے وقت ایک پیغمبر کے پیغام سے پورے ہو سکتے ہوں تو مصلح پیدا ہوتا ہے اور اگر زمانہ ایک نئے پیغام کا تقاضا کرے تو نیا پیغمبر ہی پیدا ہوتا ہے اور اگر کوئی مصلح پیدا ہو جائے تو اس کی حدود قومیت تک محدود رہتی ہیں۔ عالم انسانی کے لئے تازہ پیغام ایک نئے پیغمبر کے پاس ہوتا ہے۔ یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ ایک پیغمبر کی موجودگی میں کسی قوم کے مصلح میں قوت نفوذ و شوکت باقی نہیں رہتی۔

ایک پیغمبر کی موجودگی میں کسی قوم میں مصلح کا پیدا ہونا جذبۂ قومیت کی بازگشت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ یہاں ایک بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایک مصلح وقت خواہ دوران ارتقاء میں کتنی بھی شوکت اور نفوذ کا مالک کیوں نہ ہو وہ اپنے پیغمبر کا مقابل صلاحیت کے لحاظ سے نہیں ہو سکتا۔ اہمیت کے لحاظ سے تیسرا مقام فلسفی کا ہے۔

فلسفی۔ پیغمبر اور مصلح کی ذات وجدانی تقاضا ہے۔ مگر اس وجدانی تقاضا کو ....
.... پورا کر کے ایقان کے ساتھ کوئی تضاد پیدا نہیں ہوتا۔ ایقان محض ذہنی کیفیت کا نام ہے فلسفی ایقان محض کا تقاضا اور عقل محض کی کاوش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی فلسفہ انتہائی تشکک کے دور میں پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ تشکک ان بنیادی اقدار سے آگے نہ بڑھے جو حکماء قدیم نے قائم کئے ہوں تو ان اقدار کی بناء پر ایک اذعانی (DOGMATIC) فلسفہ وجود میں آتا ہے اور اگر یہ تشکک ہر پرانی قدر کو پلیٹ دے تو ایک نیا CRITICAL تنقیدی فلسفہ پیدا ہوتا ہے۔ جدید تنقیدی فلسفہ کی تو بنیاد ہی ڈیکارٹ نے شبہ تام پر رکھدی یہاں تک کہ کانٹ نے CRITIQUE.OF.PURE.REASON کے بعد CRITIQUE.OF. PRACTICAL REASON لکھ کر حکمت نظری کا تار و پود بکھیر کے رکھ دیا اور خود بالآخر پکارا کہ "مابعد الطبیعات کا علم انسان کے لئے ناممکن ہے"، حکمت نظری کو طبعی علم کے تخمین و ظن کی حدود میں رکھ کر سائنس کی بنیادوں کو استوار کیا اور اس طرح ایقان و عرفان کی کشمکش سے جو الجھن پیدا ہوتی ہے اس سے نجات دلا دی یہ تو غیر جملہ معترضہ تھا۔ فلسفی کا پورا تجزیہ کرنے کے لئے مندرجہ ذیل باتوں کو ذہن نشین کرنا چاہیئے۔

دور تشکک کے نتیجہ میں ایک ذہنی بغاوت اور بحران کے بعد جو شخصیت اس تشکک کو عقل محض (حکمت نظری)

سے کرنے کی سعی کرے اور فطرت کی محض ذہنی کیفیتوں کو ایک نقطہ پر مرکوز کرے اسکو فلسفی کہتے ہیں۔ فلسفہ یونانی
لفظ فلو سے ماخذ ہے جس کے معنی "خرد کی محبت" ہے اور خرد کی محبت سے مراد ذہنی تسلسل اور منطقی تجزیہ
کرنے کے ہیں فلسفی کا یہ نقطہ جس پر وہ تمام ذہنی کیفیتوں کو مرکوز کرتا ہے اس کا محور ہوتا ہے اور وہ ساری
کائنات و عمرانی زندگی کو اسی محور سے کھڑے ہوکر جانچتا ہے۔

اس دوران میں وہ زندگی سے جو حقائق روزمرہ اور عمل کا بازار ہے دوری اختیار کرتا ہے۔ وہ زمانی نسلی
اور قومی حدود کو توڑتا ہے۔ اُن سے متاثر نہیں ہوتا۔ وہ سنگ دل ہے دھڑکتا ہوا دل نہیں لیکن وہ ایک ٹھوس
ذہن ہے اور ذہنی استغراق کا مظہر اتم ہے۔ اس کا کلام عام فہم اور جذباتی نہیں بلکہ خشک اور مشکل ہوتا ہے۔ وہ ذہنی
ایقان سے آگے نہیں بڑھتا۔ اس کی اپیل اعلیٰ دماغ کے لئے ہوتی ہے۔ اس کے پیغام میں کوئی اور طالب علم فن کاری
یا تدبر سے کوئی اثر نفوذ پیدا کرتا ہے۔ اگر کوئی فلسفی تقلیدی فلسفہ پیش کرے تب بھی اس کے لئے یہ ضروری ہے
کہ وہ اس میں ایک جدت اور لچک پیدا کرکے تسلسل نظری سے منضبط کرکے منطقی صورت واضح کردے۔

فنکار:۔ اہمیت کے لحاظ سے چوتھا مقام فن کار کا ہے اور شاعر فن کار میں ہی داخل ہے۔ شاعر عشق کا ذہنی
یا نظری مظہر ہے۔ وہ جذبۂ عشق کی بے تابی کی آواز ہے۔ وہ ذرا سے جھونکے سے بیقرار ہوتا ہے اور اپنی بیقراری
کا اظہار لطیف فن کارانہ انداز میں کردیتا ہے۔ ایک ستار کی طرح ذرا سی جنبش پر حرکت کرکے وہ ایک سریلی آواز
نکالتا ہے۔ اس کی اپیل عوام کے لئے ہوتی ہے۔ شاعر ماحول سے تاریخ سے ......، نسل سے قومیت سے عصبیت
سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اگر شاعر تھوڑی سی ذہنی گہرائی کا مالک ہو تو فوراً کسی نظریہ پرستیدا ہوکر فن کارانہ
رنگ میں اس کے حسین پہلوؤں کی تصویر کھینچتا ہے اور اسی کو بعض لوگ دیکھ کر اسے غلطی سے فلسفی پکارتے ہیں
شاعر ہر خارجی شئے و حادثہ پر داخلی تعصب و عشق کا رنگ چڑھا کر اُسے دیکھتا ہے۔ شاعر اور فلسفی ضدین
ہیں اور کسی شاعر کو فلسفی کہنا محض بے علمی ہے اور اگر ایک شاعر کی شاعری ثابت ہے تو اس کے متعلق
فلسفی ہونے کا وہم کرنا بھی مبادی علوم سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ ایک آخری بات اس سلسلے میں جو قابل
غور ہے یہ ہے کہ شاعری چونکہ عشق کا محض نظری اظہار ہے اور جب نظری اظہار پر انسان کو تسکین مل جائے
تو قوتِ عمل اس میں مفقود ہوتی ہے اس لئے شاعر باعمل نہیں ہوتا اور اگر کوئی جذبہ مثلاً صحبت مرد کامل یا ایمان کامل
شاعر کو غافل بنا دے تو پھر وہ شاعری سے نکل کر تصوف کے میدان میں داخل ہوتا ہے اور اس کی شاعری پھر
صوفی کا فن کارانہ بیان ہوتا ہے۔ شاعری نہیں ہوتی۔ پھر وہ رومی بن جاتا ہے اور پھر اُس کی مثنوی شاعری کا مجموعہ نہیں بلکہ
تجربات تصوف کا ایک ذخیرہ ہو جاتا ہے۔ بعض وقت بھی عشق کا غلبہ جب ذہن پر غالب آتا ہے اور توازن قائم
نہیں رہتا تو مجذوب پیدا ہو جاتے ہیں۔ عالم سفلی میں جذبۂ عشق اسفل جنسی میلان ہوتا ہے اور عالم علوی میں عرفان

ہوتا ہے۔

ایک بہت ہی اہم امر یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ صوفی کا ایک خاص نظریہ ہوتا ہے اس کے کلام میں تضاد نہیں ہوتا اور اس کا عمل نہایت بلند ہوتا ہے۔ وہ کسی صاحب دل اور ولی کا مخالف نہیں ہوتا اور اس سے بعض اوقات فوق العادت کرامت بھی ظاہر ہوتی ہے جو دراصل انسان کے مخفی قویٰ کے اس کمال کا کرشمہ ہے جب وہ قوت عمل سے نقطۂ کمال کو پہنچکر عالم اسباب کو متاثر کرتے ہیں۔

اہل تصوف کا کلام عمل کی بلندی کے ساتھ ساتھ ہی بلند ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ کلام میں تو بلندی ہو اور عمل صفر۔

اب ہم اقبال مرحوم کا مطالعہ کرتے ہیں

علامہ مرحوم کے فطری میلان کو دیکھنے کے لئے زیادہ گہرا جانے کی ضرورت نہیں۔ بہت سی شخصیتوں کا احترام مؤرخ یا مبصر کے لئے بسا اوقات دشواری پیدا کرتا ہے حتیٰ کہ یہ احترام ہی ایسی شخصیتوں کے اسفل کلام کو بے نقاب اور واقعات کو قلمبند ہونے نہیں دیتا اور پھر متاخرین کے لئے تاریخ مشتبہ ہو جاتی ہے۔ بعض شخصیتوں کے اقوال و افعال میں خواہ مخواہ ایک گہرائی تلاش کی جاتی ہے جو دراصل مفسر کی اپنی گہرائی ہوتی ہے۔ اس کی مثال ایک ایسے عاشق کی ہے جو اپنے محبوب میں.... ایک حسن دیکھتا ہے جو دراصل اسکے اپنے ذہن کا کرشمہ ہوتا ہے اور محبوب میں وہ بات ہی نہیں ہوتی۔ اس لئے یہ انتہائی ضروری ہے کہ کسی مسلک کی وکالت کرتے وقت وابستگیٔ کا جذبہ ہر ممکن حد تک اثر انداز نہ ہونے پائے۔

اسی اصول کے مدنظر ہم علامہ صاحب کے فطری میلان پر جب غور کرتے ہیں تو آپ میں شاعر عریاں ہے قرآن کریم کے معیار کو سامنے رکھکر اقبال ایک شاعر کی طرح ہر وادی میں سرگرداں ہیں اور جو کہتے ہیں اس پر عمل نہیں۔ جیسے کہ ارشاد ہے:-

اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ یَّهِیْمُوْنَ ٥ وَ اَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ ٥

مندرجہ بالا مضمون میں جہاں میں نے شاعر کا تجزیہ کیا ہے وہ بھی اسی مضمون کا ہے بلکہ کلام الٰہی نے فصیح و بلیغ انداز میں شاعر کا مکمل تجزیہ کیا ہے۔

اب ہم آیت کے پہلے حصہ کی روشنی میں علامہ مرحوم کے مختلف تاثرات درج کرتے ہیں جو انہوں نے مختلف اوقات میں ظاہر کئے۔

وطنیت کے جذبے سے سرشار ہو کر آپنے فرمایا:-

سچ کہدوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

پتھر کی مورتی میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

جب مُسلم انڈیا کی وطنی سیاست فیل ہوگئی اور مسلم لیگ کی ضرورت محسوس ہوئی تو آپ بھی ملّی سیاست کی حمایت میں پکار اُٹھے :۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

جب آپ نے ترکی - افغانستان اور ایران میں ... مغربی افکار کا غلبہ محسوس کیا اور اسلامی ممالک کی سیاسی کمزوری کا احساس ہوا تو اپنی توجہ نظریۂ اسلام کی طرف پھیر دی اور ایک Religious ADVENTURER کی طرح مسلمان کو مندرجہ ذیل پیغام دیا

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے

اسی لئے وہ زیادہ تر مشرقی فکر سے سوچتے تھے ۔ چنانچہ اسلام کی مغرب میں تبلیغ کے متعلق فرماتے ہیں :۔

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

علامہ مرحوم ایک طرف محض اس لئے ختم نبوت کے قائل تھے کہ وہ روایتی مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے تھے - دوسری طرف سے وہ قوم کی جلالی تاریخ کے احیاء کے لئے نبوت کو جاری بھی سمجھتے تھے اور صرف ایسی نبوت کے خلاف تھے جس میں سیاسی شوکت نہیں - چنانچہ آپ فرماتے ہیں

وہ نبوت ہے مسلماں کے لئے برگِ حشیش
جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

یعنی اگر قوت و شوکت کا پیام ہو تو پھر جائز ہے ۔ ورنہ اس میں بھی یہ شرط ہے کہ وہ شوکت مسلمان کے لئے ہو یعنی ایک قومی نبوت ہو۔

الہام اور روایتی قومیت کی جنگ نے آپ کو قومیت کی وکالت کرنے کے لئے آمادہ کیا چنانچہ آپ فرماتے ہیں

زندہ ہے فقط وحدتِ افکار سے ملت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

یعنی اگر ملت کے افکار مسخ شدہ ہو کر بھی باعث وحدت ہوں اور کوئی الہام ان مسخ شدہ افکار کو رد کر دے تو وحدت کی خاطر اس الہام کو ہی رد کرنا چاہیئے ۔

آپ کو اسلام کی احیا مسلم قومیت سے باہر نظر ہی نہ آتی تھی اور میرا تو خیال ہے کہ آپ اسلام کو مسلم قومیت ..... کی وجہ سے مانتے تھے نہ کہ مسلم قومیت کو اسلام کی وجہ سے۔ چنانچہ اسی نوحہ خوانی میں آپ فریاد کر رہے ہیں فرماتے ہیں:

اے رُوحِ محمدؐ:۔

شیرازہ ہوا ملتِ مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

مسلم قومیت کو سب سے بڑا خطرہ انگریزی ملوکیت کا تھا اس لئے آپ امامت کو بھی بغاوت کی ترغیب دیتے ہیں فرماتے ہیں:۔

فتنۂ ملتِ بیضا ہے امامت اس کی
جو مسلماں کو سلاطین کا پرستار کرے

مگر کچھ مصلحتوں سے متاثر ہو کر پھر آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ:۔

اے تاجدار خطۂ جنت نشانِ ہند

ہنگامۂ وغا میں میرا سر قبول ہو
اہلِ وفا کی نذرِ محقر قبول ہو

اپنی مشہور کتاب ضربِ کلیم کے افتتاح میں ہی آپ اعلیحضرت نواب سر حمید اللہ خاں فرمانروائے بھوپال کی خدمت میں پوری کتاب بطورِ سرمایہ پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من
کہ گل بدست تو از شاخِ تازہ تر ماند

اب کہاں سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ اور کہاں فرمانروائے بھوپال کی خوش آمدید۔ مگر چونکہ فرمانروائے بھوپال مسلم قوم سے تھے اس لئے مضائقہ نہ تھا۔

جب دین کو سیاست سے الگ کرنے کی تدبیر سوچ کر مسلمان کو جو بغیر دین کے حرکت نہیں کرتا سیاست میں پچھاڑنے کی کوشش کی تو آپ نے یہ بھی فرمایا:۔

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یہاں تو آپ نے جلال پادشاہی کو بھی جائز قرار دیا بشرطیکہ پادشاہ مسلمان ہو کیونکہ آپ نے جا بجا دین کو مسلم

قومیت سے تعبیر کیا۔

جب آپ نے محسوس کیا کہ بڑے بڑے سرمایہ دار مسلمان بھی دین کے نام پر .... کفار سے رابطہ کر کے مسلم عوام کو دبائے رکھتے ہیں تو آپ نے فرمایا:۔

حق را بسجودے صنماں را بطوافے
بہتر ہے چراغ حرم و دیر بجھا دو

یہاں آپ نے بظاہر لادینی کا اظہار فرمایا۔ اور یہ دراصل اُن مسلم سرمایہ داروں اور سلاطین کے خلاف ردِ عمل تھا جو قومیت کو کمزور کر رہے تھے۔ اور وہ بھی دین کے نام پر۔

شاعر کی فطرت کے متعلق جو آیت میں نے درج کی تھی اس کے پہلے حصہ کی روشنی میں میں نے مندرجہ بالا شعر نقل کئے اور اس کے دوسرے حصے کی روشنی میں دو مختلف مقامات سے نقل کرتا ہوں۔ کیونکہ اپنی کمزوری کا اعلان اگر کوئی عالِم دو جگہ بھی کر دے تو کافی ہے فرماتے ہیں:۔

میں نہ عارف، نہ مجدّد، نہ محدث۔ نہ فقیہہ
مجھکو معلوم نہیں کیا ہے نبوّت کا مقام
ہاں مگر عالمِ اسلام پہ رکھتا ہوں نظر
فاش ہے مجھ پہ ضمیرِ فلکِ نیلی فام

یعنی آپ نے فرمایا ہے کہ آپ کو کسی ایسے مقام کا دعوےٰ نہیں جو قوم آپ سے منسوب کرنا چاہتی ہے مگر آپ عالمِ اسلام سے یعنی مسلم قوم کی تاریخ اور حال سے باخبر ہیں اور آپ پر یہ راز بھی فاش ہے کہ فلک اس قوم کا ساتھ نہیں دیتا جو اشمال سے ہاتھ دھو بیٹھے اس لئے آپ اعمال کی طرف توجہ دیتے ہیں اور اعمال کا آپ مجددانہ یا محدثانہ تجزیہ نہیں کرتے کیونکہ آپ شاعر ہیں اور وہ آپ کا کام نہیں۔

دوسری جگہ آپ فرماتے ہیں:۔

اقبال تو اُبدیشک ہے بڑا من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی بن تو گیا کردار کا غازی بن نہ سکا

یہ اس لئے کہ آپ نے قوم کو متنبہ کیا کہ وہ کہیں آپ کے کردار سے ٹھوکر نہ کھائیں۔

اب تک تو میں نے علامہ مرحوم کا کلام ہی پیش کیا اب میں علامہ صاحب کے متعلق وہ خارجی واقعات درج کرتا ہوں جن سے بھی آپکے شاعرانہ مقام کا ثبوت ملتا ہے:۔

آپ اس زمانے میں پیدا ہوئے جبکہ مسلمان دورِ انحطاط سے نکلنے کے لئے سیاسی کاوشیں کر رہے

تھے اور مسلم قائدین نے ہندو قوم کے اشتراکِ عمل سے انگریز کو نکالنا چاہا۔ ہندو کا اشتراک حاصل کرنے کیلئے وطنیت کا ہنگامہ ضروری تھا۔ اس زمانہ میں علامہ صاحب نے وطنیت کی وادی میں شعر کہے۔ جب بیدار مغز ہندو نے فرنگی جمہوریت میں اُلٹا مسلمان کو مدغم کرنے کی سوچی تو ملی ردّعمل میں اقبال نے بھی وطنیت کی تردید میں ترانے گانے۔ اسی طرح علمی رنگ میں مسلمانوں کا تعلیمیافتہ طبقہ مغربی فلسفۂ الحاد کا شکار ہوتے دیکھ کر علامہ کی قومیت فلسفہ کے خلاف بڑے شدّ و مد سے چیخ اٹھی اور ایک سید زادے کو نصیحت کرتے ہوئے آپ نے فرمایا۔

شعلہ ہے تیرے جنوں کا بے سوز ٭ سُن مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز
انجام خرد ہے بے حضوری ٭ ہے فلسفہ زندگی سے دُوری

مگر زمانہ چونکہ فلسفیانہ جدال کا تھا اس لئے زمانے کی روش کو دیکھ کر آپ نے موجودہ مسلم قومیت کے حسب حال نیٹشے کے فلسفہ سے نظریۂ خودی مستعار لیا اور اس میں کچھ جدت اور لچک پیدا کر کے اس کو نئے طور سے پیش کیا۔ چونکہ مسلمان تھے اس لئے اس کو اسلامی قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی اور کہیں بھی نظریۂ خودی کو مدلل طریقے سے پیش نہ کیا۔ نہ اس کا منطقی تجزیہ کر کے تسلسل کے ساتھ کمال تک پہنچا کر واضح کیا کیونکہ یہ کام تو کسی فلسفی کا تھا۔ البتہ فن کارانہ انداز میں یہ نظریہ شاعری کے قالب میں پیش کیا۔

مسلمانوں کے زوال و انحطاط کو دیکھ کر آپ کو جب احمدیت میں غلبۂ اسلام کی جھلک نظر آئی تو ملی قومیت کے حدود کو توڑنے والا کلام بھی پیش کیا اور "ملت بیضا پر عمرانی نظر" کے عنوان سے علیگڈھ میں تقریر کرتے ہوئے قادیانی سیرت کو ٹھیٹھ اسلامی بتایا مگر جب مسلم قومیت کی جگہ آپ نے اسلام کی بنیادوں پر ہی ایک نئی قومیت کے معرض وجود میں آنے کا ڈر محسوس کیا تو فوراً "احمدازم اینڈ اسلام" میں احمدیت کی مخالفت کی اور اپنے شاعرانہ کلام میں بھی احمدیت کے مبلغانہ ٹیکنیک پر حملے کئے اور بانیٔ احمدیت کے دعاوی پر بھی اشارۃً نکتہ چینی کی۔

یہاں یہ بات عرض کر دینا ضروری ہے کہ آپ کی روزمرّہ زندگی میں بھی ایسے واقعات بہت ملتے ہیں اور ان سے بے شمار اصحاب واقف ہیں جو آپ کی عملی زندگی کی تصویر ہیں۔ مگر آپ کا احترام اس چیز کی اجازت نہیں دیتا کہ ان واقعات کو درج کیا جائے جو پرائیویٹ زندگی سے متعلق ہوں البتہ پبلک لائف کے سلسلے میں چند واقعات درج کرنا غیر از بحث نہ ہوگا۔

آپ نے اپنے کلام میں بار بار مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع ہو کر مومنانہ طرز عمل کی ترغیب دی لیکن آپ کبھی خود اس سلسلے میں میدانِ عمل میں نہ آئے۔ حتیٰ کہ سیاسی کشمکش میں بھی آپ نے نظریاتی طور پر مسلمانوں کا ہر لمحہ ساتھ دیا مگر آپ نہ وطنیت کے ہنگامی تحریک میں اور نہ ملیت کے ہنگامی تحریک میں عملاً کبھی میدان میں آئے۔ کشمیر کمیٹی کی صدارت کو بھی جب آپ نے سنبھالا تو مسلمانوں کی سیاست ہی کشمیر میں مفلوج ہو گئی اور اس کے برعکس جواہر لال نہرو نے کشمیر میں اپنے

مہرے تیار کئے حالانکہ آپ سے پہلے مرزا بشیرالدین محمود کی صدارت میں سیاسیات کشمیر ہندو راجہ اور برطانیہ کے لئے کافی حد تک سر درد کی طرح پریشان کن رہی۔

اسی طرح آپ نے کسی اخلاقی تحریک کی بنیاد نہ ڈالی جس کی آپ قیادت سنبھالتے۔ آپ نے اس تصوف کو جو زندگی سے دور لے جاتا ہے غلط قرار دیا مگر کوئی ایسا صوفیانہ عمل پیش نہ کیا جو زندگی کے قریب ہو کر متاثر کرے۔ سیاسی رنگ میں البتہ مسٹر جناح نے کسی حد تک آپ کی تعلیم پر عمل کیا۔

اول تو اقبال کا کامیاب شاعر ہونا ہی آپ کے فلسفی یا مصلح ہونے کی تردید ہے مگر چند امور کو ذہن میں رکھ کر ہم آپ کے نظریہ خودی پر تھوڑا سا غور کرتے ہیں۔

اقبال مسلم قوم میں پیدا ہوئے تھے اور آپ نے اسلام سے کبھی قطعی انکار نہ کیا۔ اسلام اس دور سے گذر چکا تھا جبکہ اسلامی بنیادی اقدار ہی مشتبہ ہو چکے تھے۔ وہ دور سرسید کا تھا۔ اور سرسید، مفتی محمد عبدہٗ، مرزا غلام احمد و دیگر علماء کی خدمات کے بعد اب اسلام پر صرف سیاسی حملے ہو رہے تھے۔ ویسے بھی سائنس اس مرحلے پر پہنچ چکا تھا کہ مذہبی مبادیات سے عقل کی بنیادوں پر انکار کا زمانہ ہی ختم ہو گیا تھا۔ سائنس نے اپنی توجہ صرف طبعی حقائق پر مرکوز کر دی تھی۔ مختصراً یہ کہ اقبال کا زمانہ کسی ایسے تشکک کا زمانہ ہی نہ تھا جو ایک فلسفی کا متقاضی ہوتا۔ اب مغرب میں تبلیغ اسلام کی کامیابی کے آثار نے تو مغربی فلسفہ کا رعب ہی ختم کر دیا۔ دوسری بات یہ قابل غور ہے کہ اقبال نے کسی ایک جگہ بھی فلسفۂ خودی کو کسی تسلسل اور مدلل رنگ میں پیش ہی نہیں کیا۔ اور یہ تیسری بات جو بالکل واضح ہے کہ اقبال کا غالب کلام شعر و شاعری میں ہے۔

نظریۂ خودی پر غور کرنے سے پیشتر یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اقبال نے نظریۂ خودی کو ہی کیوں اپنایا ہم امور ذیل کی روشنی میں اس کو سمجھتے ہیں:۔

اقبال کشمیری النسل برہمن تھے۔ کشمیری قوم میں پیر پرستی یا ہیرو ورشپ فطرتاً داخل ہے۔ چونکہ کشمیری نسلاً اسرائیلی ہیں اس لئے ان میں یہودیوں جیسی عصبیت بھی موجود ہے۔ کشمیری النسل ہونے کے علاوہ مذہباً اقبال مسلمان تھے اور طبعاً شاعر اس لئے مسلم قومیت ان کی گھٹی میں موجود تھی۔ یہودی قوم کے انحطاط کے بعد جس طرح یہود ایک جلالی مبشر کے منتظر تھے اسی طرح مسلمان بھی ایک جلالی مہدی کے منتظر تھے تاکہ وہ اپنی جلالی تاریخ کے خواب کا احیاء کر سکیں۔ چونکہ وہ مہدی ظاہر نہ ہوا اس لئے اقبال نے مہدی سے تو انکار کیا مگر نسلاً پیر پرستی کی طبیعت اور مذہباً مہدی کا تخیل تحت الشعور میں موجود تھا نیٹشے کا SUPERMAN کا تخیل قبول کرنے کے لئے بڑا سازگار ثابت ہوا۔ یہ محض ہمارا وہم ہی نہیں۔ سیاسی دور و جہد میں مسلمانوں کی ساری قوت حکومت حاصل کرنے پر مرکوز ہو گئی اور اقبال نے جہاں بار بار خودی کو پیش کیا وہاں پُرشوکت حکومت کے لئے بھی مسلمانوں کو اُبھارتے رہے۔ مسٹر جناح کو

خط و کتابت کے ذریعہ مسلم قوم کی ہیرو ورشپ کے مزاج سے آگاہ کیا اور مسلم قوم کے احساس برتری کا (SUPERIORITY-COMPLEX) تجزیہ کر کے الگ قومی حکومت کا نکتہ بھی سمجھا دیا۔

مسٹر جناح نے اپنی تقریروں میں بار بار الگ تمدن الگ شاندار روایات اور الگ قومیت پر قوم کو ابھارا قوم نے مسٹر جناح کو عملاً و قولاً سیاسی SUPERMAN تسلیم کیا اور پاکستان حاصل کیا۔

یہ تو جملۂ معترضہ سمجھئے۔ آیئے نظریۂ خودی کو جانچیں۔

دنیا میں بہت سے مباحث محض الفاظ کے غیر محتاط استعمال سے ہوتے ہیں۔ اس لئے الفاظ کو ایک معین معنی کے لحاظ سے ہی سمجھنا چاہیئے ورنہ علمی الجھنوں سے کبھی بھی نجات حاصل نہ ہوگی۔ خودی کے معین معانی پر جب غور کیا جائیگا تو اس کا مطلب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ انسان اپنے وجود میں وہ قوت محسوس کرے وہ کبریائی دیکھے جو اس کے ذہن سے ہر رعب کو دور کر دے اور وہ تمام ذہنی و نفسیاتی الاہوں کو توڑ کر اپنی کبریائی کا اظہار کرے۔ اتم طور پر جس میں یہ اظہار موجود ہو وہی (SUPERMAN) ہوگا۔ اگر کسی خارجی ذات کا رعب طاری ہو تو پھر خودی کا خاتمہ ہے۔

نیٹشے نے لاالٰہ کو ایک فلسفی کی طرح مدلل طریق سے پیش کیا اور تکمیل تک پہنچایا اور جرمن آئیڈل ازم نے اس کے (SUPERMAN) کو جرمن قومیت اور (FEUHRER) کا جامہ پہنایا جو اندرونی منطقی تضاد کی وجہ سے قائم نہ رہ سکا۔

علامہ مرحوم نے یہ نظریہ لے کر اس میں الا اللہ بھی شامل کر کے فرمایا۔

خودی کا سِرّ نہاں لا الٰہ الا اللہ

حالانکہ یہ ایسی بات ہے جیسے کوئی کہے کہ سفید کاغذ کی تعریف یہ ہے کہ "سفید نہیں"۔ علامہ مرحوم نے اللہ کو اس لئے شامل نہیں کیا کہ وہ ان کا کوئی فلسفی تجزیہ تھا بلکہ اس لئے کہ وہ مسلمان پیدا ہوئے تھے۔ ان کا یہ نظریہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی صاحب (ISLAMIC COMMUNISM) کا نظریہ پیش کرے حالانکہ کمیونزم ایک الگ نظریہ ہے اسی طرح اقبال کا نظریہ (ISLAMIC FACISM) ہو سکتا ہے۔ اگر (ISLAMIC FACISM) کی کوئی معقول تعریف ہو سکے۔

نیٹشے کے فلسفہ کی بنیاد انسانی ذات کے کمال میں مضمر ہے اور کمال پر کبریائی کا اظہار اور احساس ... (SUPERMAN) کا مظہر ہے عقلی کاوش سے جب تصوف کا بھی تجزیہ کیا گیا تو وہ ایک نفسیاتی شعور سے زیادہ ثابت نہ ہو سکا۔ ہمہ اوست کے ماننے والوں نے اسی نفسیاتی شعور کو اعلیٰ مقام پر خدا قرار دیا اور ختم نبوت پر بحث کرتے ہوئے اقبال نے بھی یہی دلیل دی کہ چونکہ عقل اس بلند مقام تک پہنچ گئی ہے اب

وجدان کا تجزیہ کرنے کے بعد انسانی عقل نے وجدان پر اپنی برتری ثابت کر کے انسان کی رہنمائی کرنے کے لئے اعلیٰ صلاحیت کا ثبوت دیا یہاں تک کہ اب نبوت کی ضرورت نہ رہی۔ ہم یہ پوچھتے ہیں کہ اگر یہ درست ہے تو عقل نے جو مارکس کے ذریعے انسانی گلہ کی راہنمائی کی ہے موجودہ روشن زمانے میں اسکو کس بنا پر رد کیا جائے جبکہ مارکس موجودہ عقلی دَور میں بقول علامہ اقبالؔ

"نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب"

صاحب کتاب بھی ہے۔ اسے اقبالؔ صاحب سرمایہ از نسل خلیل یعنی آں پیغمبرے بے جبرائیل کہتے ہیں۔ لیکن :۔ "قلبِ اُو مومن دماغش کافر است" کی کوئی دلیل علامہ مرحوم کے پاس نہیں۔

خودی کے ایک فلسفہ سند جواز جو اقبالؔ کے ہاں ہمیں نیٹشے سے مستعار ملتا ہے اس کے سوا کوئی بھی نہیں کہ اقبالؔ اوّل اور آخر مسلم قومیت میں رنگین تھے۔ ان کی شاعری ان پر متسلط۔ وہ نہ فلسفی تھے نہ مصلح۔ وہ صرف ایک شاعر تھے۔ اور عشق کی ایک بے پناہ ذہنی تپش اور بے تاب اظہار مسلم تاریخ سے بیحد متاثر اور ایک گری ہوئی قوم کو بلند دیکھنے کی بے پناہ خواہش ان میں چٹکیاں لیتی تھی۔

ان کے تمام نظریئے اسی لئے ڈھالے گئے۔ تمام بیرونی نظریئے مسلم قومیت کے تعصب میں ٹھکرائے گئے اور معیار اسلام نہ تھا بلکہ وطنی۔ مسلم عصبیت۔ اس لئے انہیں فلسفی نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ ایک عظیم الشان قوم کی بازگشت ضرور ہے۔ جس کی تاریخ نہیت بلند اور جس کے کارنامے حیرتناک ہیں اسی لئے وہ شکوہ کرتے ہیں۔ اسی کے لئے رجائی باتیں کرتے ہیں، اسی کو بلند دیکھنے کی انہیں آرزو ہے۔ اس کا اظہار ان کی تمام تحریرات میں ہے۔ اس وجہہ قوم کے متعلق ہی وہ تسلی کو کہتے ہیں :۔

جس کی تو منزل تھا میں اُس کارواں کی گرد ہوں

اور اسی کارواں کو وہ :۔

سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

ہکرا کرتے ہیں۔ لارڈ بائرن کی شاعری جیسے عثمانی ترکوں کے خلاف یونان کے کام آئی کیا اسی طرح اقبالؔ مغربی سامراجیوں کے مقابل مسلم قومیت کے کام نہیں آئے ؟

خط و کتابت کرتے وقت چٹ نمبر کا
حوالہ ضرور دیں

مغرب کی آواز

[اس عنوان کے تحت ہم آپ کے سامنے مغربی کتب اور اخبارات کے تراشے پیش کرتے ہیں جس سے آپ مغرب کا نکتۂ نظر اسلام اس کے متعلقات مغرب کی بحرانی صورت حال اور جس درد و کرب سے مغرب دو چار ہے اس کا اندازہ کر سکیں گے۔]

آرنلڈ۔ جے۔ ٹائین بی نے جو تاریخ کے مشہور اسکالر ہیں حال ہی میں تہذیب کا امتحان CiviliZATION ON-TRIAL کے عنوان سے اپنے مختلف مقالات کو یکجا کیا ہے۔ جن میں طبقات اور جنگ کے مسائل کا تجزیہ کیا گیا ہے اور ان کے ممکن علاج کو بھی بتایا ہے۔ ٹائین بی (TOYNBEE) کی ہی زبان میں وہ مسائل یوں ہیں:۔

"ہمارے مغربی KNOW-HOW اشتیاق جستجو نے تمام دنیا کو ایک قابلِ آبادی قابل عبور سطح میں تبدیل کر دیا ہے، اور اس نے جنگ اور طبقات کو جو تہذیب ہی کی پروردہ دو برائیاں ہیں انسان کے لئے انتہائی مہلک حد تک بھڑکا دیا ہے لاشعوری دریافتوں کے اس سیلاب نے آج ہمیں اس طرح للکارا ہے جو انتہائی ہلاکت انگیز ہے۔

ہمیں اس سے بچنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے؟ ــــ سیاسیات میں آئینی امداد باہمی کے طرز کی ایک عالمی حکومت پیدا کی جائے۔ معاشیات میں آزاد و زرتعدی اور سوشلزم کے مابین حالات اور وقت کے ضروری تقاضوں کے مطابق رد و بدل کر کے ایک قابل عمل معاہدہ کروایا جائے۔ روحانی زندگی میں سیکولر (لادینی) بالائی ڈھانچ کو پھر سے دینی اساس پر اٹھایا جائے۔"

ٹائین بی دنیا کے تمام مشہور مذاہب کے عناصر کو اکٹھے ہی چاہتے ہیں، عیسائیت، اسلام، ہندو یت اور

بدھ دھرم کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کا خیال ہے کہ ہندویت اور بدھ دھرم کی بھکشوانا زندگی کے احیاء کی کوئی امید نہیں۔ وہ اب دنیا میں صرف ازمنہ قدیم کے فاسلز FOSSILS کی حیثیت میں باقی ہیں۔ البتہ عیسائیت اور اسلام تبلیغی سرگرمیوں کے داعی ہیں۔ انہی دو میں سے کون اب زمین پر امن قائم کر سکے گا، یہی آخری اور ضروری سوال ہے جو اب حل کرنا چاہیئے۔

ٹائن بی اس کے تحت سوچتے ہیں تو اسلام کی رُوحانی اور اخلاقی قوت کے متعلق اُن کے انداز سے دلچسپ ہیں شراب کے بارہ میں منطقۂ حارہ کے بعض ممالک کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"منطقۂ حارہ کے حالیہ دریافت کردہ اور جلد جلد سیاحت شدہ علاقوں میں مغربی تہذیب نے جہاں معاشی اور سیاسی ہمہمی پیدا کی ہے اُسی سانس میں وہاں سماجی اور رُوحانی بے حسی کو بھی فروغ دیا ہے......

پھر بھی مغربی تہذیب نے جو رُوحانی خلا کو پُر کرنے میں بے حد بدنما کام ہی کسی بھی اور رُوحانی طاقت کی دسترس میں ایسے مادی ذرائع رسل و رسائل مہیا کر دیئے ہیں جن سے وہ ان علاقوں تک بآسانی پہنچ سکے۔

منطقۂ حارہ کے دو علاقوں وسطی ایشیا اور انڈونیشیا میں اسلام وہ رُوحانی قوت ہے جس نے مغربی مادہ پرست تہذیب کے پیشروؤں کے پیدا کردہ وسائل کا فائدہ اُٹھایا ہے۔ اور اگر ان خطوں کے باشندوں نے کبھی بھی وہ مقام رُوحانیت حاصل کیا ہے۔ جہاں وہ اپنی رُوحوں کو اپنا کہہ سکیں تو یہ صرف اسلامی رُوح ہے جس نے اُن کی اس بے حسی میں ایک تازہ اور نئی توانائی پیدا کر دی ہے۔

اس رُوح کا اظہار بہت سے عملی پہلوؤں پر ہو رہا ہے اور اس میں سے ایک شراب کی غلامی سے آزاد کرانا بھی ہے جو صرف مذہبی ایمان کے سبب ہی ہوا ہے جو ایک ایسا کام کرانے میں کامیاب ہو سکی جو کبھی بھی خارجی قانون سے ممکن نہ تھا۔"

ٹائن بی نے عالم انسانی کے لئے دوسرا عجیب خطرہ نسلی احساس کو بتایا ہے۔ اور اس پر کہا ہے:

"نسلی احساس کو مسلمانوں میں سے بالکل مٹا دینا اسلام کی سب سے بڑی اخلاقی فتوحات میں سے ہے، اور اس دُنیا میں اسلام کی اس خوبی

کی اشاعت کی شدید ترین ضرورت ہے"

اس کے بعد انہوں نے امریکی اور افریکی باشندوں کے ساتھ مغربیوں کے نسل کش رویتے کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ :-

" اُن کا یہ طرزِ عمل ہندوستان کے اُس تباہ کُن ادارے ہی کے عناصر بن رہا ہے - جہاں یہ کئی صدیوں میں اپنے پورے عروج کو پہنچ گیا تھا - جسے ہم ذات پات کے نام سے بڑا بھلا کہتے ہیں "

آخر میں ٹائین بی کہتے ہیں کہ :-

" نسلی قبولیت کی قوتیں اب بھی ایک ہاری ہوئی (LOSING BATTLE) جنگ لڑ رہی ہیں اور اسلام ان کے خلاف ایک بر وقت امداد کا کام دیگا - اسلام کے سامنے اب بھی ایک بلند تر اور اہم ترین رُوحانی مقصد کی بجا آوری ہے "

ایک طرف تو ٹائین بی کا اسلام کے متعلق یہ ردِ عمل ہے دوسری طرف عیسائیت کے بارہ میں اُن کا ارشاد ہے :-

" اسی دور میں جیسوئیٹ مبلغین رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مشنری سو سالہ جنگ کی المیہ ناکامی کے بعد جو انہوں نے اپنے دین کی برتری کے لئے کی تھی تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ دین ہی اُن کی تمدنی وراثت میں ایک ... بے محل اور بے جوڑ عنصر تھا - کیوں نہ اب دینی جنگوں کو ختم کرنے کے لئے دین کو ہی ختم کر دیا جائے اور اپنی تمام تر توجہ فزیکل سائنس کو عملی حالات پر انطباق کیلئے مرتکز کیا جائے ـــــ جو ایسا مسلک ہے جس میں کوئی اختلاف و تضاد نہیں اور جو نفع آور بھی ہے "

جرمنی میں گذشتہ جنگ کے بعد نازیوں نے جرمن نسلی برتری کو بہت نشر کیا تھا - خونی پاکیزگی اور حاکم نسل کا تصور ہی تمام جرمن نشریات، تعلیم، ادب، صحافت، نجی محفلوں، سرکاری اداروں اور سینما کا موضوع تھا - اس ذریعے یہ تصوریت تمام جرمن قوم میں پھیلائی گئی تھی - سرکار اس کی خود افزائی کرتی ... اور زیادہ سے زیادہ مقبول عام کرتے ہیں اس کا ساتھ دیتی تھی - اس طرح دوسری نسلوں کے خلاف نفرت اور اپنی خونی پاکیزگی اور برتری کا جاہلی تصور پروان چڑھایا گیا - یہودیوں اور غیر آریائی قوموں کو جرمنی سے نکال

دیا گیا - اور ایک صاف قوم پیدا کی گئی -

اس خونی پاکیزگی کا جو حشر دوسری جنگ کے بعد ہوا وہ نہایت عبرتناک ہے - غیر اسلامی تصورتیں کس طرح تباہ ہو رہی ہیں اس کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے اور مغرب اب کیسے پکار رہا ہے - اس کے متعلق بھی اس سے کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔

آج جرمن قوم مفتوح ہے ... خود جرمنی چار بڑے حصوں میں منقسم ہے جہاں فاتح اقوام کی فوجیں متعین ہیں - نازی چھانٹی اسکیم کے ماتحت جرمنوں کو چن چن کر سماجی زندگی سے الگ کیا جا رہا ہے لیکن اس سب سے بھیانک ترین منظر جرمن نسلیت کی خونی پاکیزگی کا سقوط ہے -

ذیل میں ایک جرمن خاتون "اِل سی ماریَ" کے خیالات پیش کئے جاتے ہیں - موصوفہ جنگ کے دوران مشرقی وسطیٰ میں قیام پذیر رہیں - انہوں نے واپس جرمنی جا کر وہاں کے حالات کا اندازہ لگایا تو انہیں سب سے بڑا خطرہ جو قوم کو لاحق ہے یہ نظر آیا۔

> " جرمنی کا سب سے بڑا مسئلہ اس وقت بچوں کا ہے، اور میرے خیال میں یہ صرف جرمنی کا ہی نہیں بلکہ تمام یورپ کے لئے خطرہ ہے اگر یہ تمام دنیا کے لئے نہیں -
>
> ہٹلر نے اپنی اس خواہش میں کہ وہ جرمن آریائی حاکم نسل پیدا کرے، مسلسل ناجائز اور بغیر شادی کے تعلقات کی حوصلہ افزائی کی بشرطیکہ جانبین خالص آریائی نسل میں سے ہوں - اور اسکی پشت پر مضبوط سرکاری اور قانونی لائے تھی خاصکر ماؤں کے حقوق کی نگہداشت -
>
> سرکاری اطفال گھر، اور نرسریاں ایسے بچوں کے لئے قائم کی گئی تھیں جن کے والد کا پتہ نہ ہو۔ ....
>
> .... ایک عورت کے لئے یہ ایک عام اور معروف بات تھی کہ وہ میدان جنگ میں مارے گئے ایک سپاہی کے ساتھ بعد از مرگ شادی (POST-MORTEM MARRIAGE) رچائے تاکہ اس کا بچہ قانونی طور پر بھی جائز قرار پائے -
>
> جنگ کے آخری سالوں میں عملی طور پر جرمن مرد شہریوں کی تعداد

بہت ہی کم ہو گئی تھی۔ اس کے برعکس جرمن مقبوضہ علاقوں اور جرمن اتحادیوں کے مرد جوان علاقوں میں محنت مزدوری کرتے تھے بہت بڑھ گئے اور گو کہ ان کے جنسی تعلقات جرمن عورتوں کے ساتھ اچھے نہ سمجھے جاتے تھے۔ لیکن یہ اپنا اثر ضرور پیدا کرتے ہے پھر اتحادی مشرق اور مغرب سے بڑھے۔ بعض روسی دستے جنوبی روس کے وحشی اور غیر مہذب سپاہیوں پر مشتمل تھے۔ ان کو عام آبادیوں پر کھلا چھوڑ دیا گیا کہ جو وہ چاہیں کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں جرمن عورتوں سے زنا کیا گیا اور پھر جب ان دستوں کو اس علاقے سے ہٹایا گیا تو ان ہزاروں واپس لوٹنے والے سپاہیوں نے جرمنی میں لاکھوں ایسے بچوں کی نسل چھوڑی جن کو اپنے والدوں کا کبھی بھی پتہ نہیں چل سکے گا۔

بیرونی تسلط کے دور میں، جب بحران اور آپا دھاپی حکومت تھی، اور کھانے کو کچھ بھی نہ ملتا تھا لوگ اپنی زندگی کی ضروریات کے حصول میں کوئی سی قیمت بھی دینے کے لئے تیار تھے۔ لاکھوں جرمن مرد ابھی تک جنگی قیدی یا روسی لیبر کیمپوں میں مقید تھے ادھر اتحادی دستوں کی ایک بہت بڑی تعداد جرمنی پر قابض تھی جو خود اپنے گھروں اور عورتوں سے دور تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دوران میں زیادہ سے زیادہ بچے جرمنی میں پیدا ہوئے۔

اب جبکہ حالات نے اپنی چھانٹ شروع کی ہے، اور حکومت ـــ غیر شادی شدہ عورتوں کو حسرتناک طور پر نہایت ہی کم الاؤنس دے رہی ہے اور اخلاقی پاکیزگی (RETURN to PURITY) کی ایک مضبوط رو یورپ میں چل پڑی ہے تو عورتوں اور بچوں کے مصائب شدید ہو گئے ہیں۔ بچے ناپسندیدہ طور پر بڑھ رہے ہے، ان کی پرورش بری ہے اور ان سے نفرت کی جاتی ہے اور بدقسمتی سے اگر بچے آدھے سلاوی یا اطالوی یا کوئی اور یوں

تو انہیں بشلر کے پیدا کردہ نسلی عصبیت کے باعث جو اُس نے اپنی بدقسمت پودمیں بھردی ہے بہت بُرا اور غیر انسانی طریق پر دھتکارا جاتا ہے۔

خود بچوں کے مابین ظلم کے انتہائی دلخراشش واقعات ہوئے ہیں اسکولوں میں وہ بچے جو جائز طور پہ پیدا ہوئے ہیں دوسرے بچوں کے پس منظر کو طشت از بام کرنے میں بہت تیز ہیں جن سے ان کی سُبکی لازم آئے۔ مزید برآں ان دُکھوں کے علاوہ، جن کے لئے وہ خود ذمہ دار نہیں، یہ بچے انتہائی عزبت میں دھکیل دیئے گئے ہیں۔ اور جہاں ایک ماں کے کئی بچے ہیں اسے مشکل سے ہی وقت موقع اور قوت میسر آتی ہے کہ وہ ان بچوں کو پال سکے۔ نتیجۃً بچے ایک ایسے ماحول میں ہیں جو نفرت کو جنم دیتا ہے۔ اور قدرتی نفسیاتی وقاع بھی ہے کہ جب وہ بالغ ہوں گے تو نفرت ان سے پیدا ہوگی۔ اب بھی اور مستقبل میں بھی وہ اس سے سخت تنفر محسوس کریں گے جو ان کی موجودہ بدقسمتی اور مصائب کا جنم داتا ہے یا وہ جس کا انہیں یقین دلایا گیا کہ وہ ان کے ناخوشگوار بچپن اور اچھوت پن طرز سلوک کا ذمہ دار ہے۔

یہ بچے بغیر کسی ایمان اور مذہب کے پرورش پا رہے ہیں کیونکہ خود بھی وہ ایک گھناؤنی غیر مذھبی اور غیر اخلاقی جذباتیت کی پیداوار ہیں۔ ان میں دوسروں کی عزت کا کوئی تصور نہیں نہ ان کی کوئی اپنی عزت ہے اور نہ وہ ماحول کا کوئی لحاظ رکھتے ہیں کیونکہ وہ خود بھی اسی کا نتیجہ ہیں یہ نفرت اب کس رُخ مڑے گی اس کا کوئی صحیح تعین نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ وہ جو خود اپنے نکتۂ نظر میں بھی سماج کی طرف سے محض پیدائشی بناء پر دھتکارے جاتے رہے ہیں، ان سے کسی انصاف کی توقع نہیں ہو سکتی وہ کسی بھی تخیل کے نہ معاف کرنے والے انتہاپسند پیرو ہو سکتے ہیں جو انہیں اس سے نجات دلائے یا انہیں اس سماج کے خلاف جس نے انہیں ہمیشہ بُرا کہا انتقام لینے میں ممد ہو۔ وہ کسی بھی "ازم" یا متعصب انتہاپسند

انسانوں کے لئے ہتھیار بن سکتے ہیں، اور سماجی طور پر وہ غیر متوازن غیر اخلاقی عنصر ہوں گے۔ یہ بچے بدترین احساس کمتری میں پرورش پا رہے ہیں، اور اس کا ردِ عمل یقیناً یہ ہو گا کہ بڑے ہو کر وہ اپنی مرضی دوسروں پر ٹھونسنے کی انتہائی کوشش کریں گے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بالغ ہو کر بیحد چالاک، عیار، موقع پرست تیز اور سریع العمل ہوں گے اور جو کچھ بھی کریں گے پوری قوت سے کریں گے۔ انہوں نے نابالغ ہوتے ہوئے بھی لڑنا، چوری کرنا، اور پھر اپنے لئے پناہ تلاش کر لینا خوب سیکھ لیا ہے۔ یہ بہت جلد سماج کی کمزوریوں، اس کے تانے بانے اور روایات کو پکڑ لیا کرینگے اور اپنے مخالفت کی گرفت میں بہت سخت ہوں گے۔ عمومی خواہش ان میں دوسروں سے عزت کروانے اور معاشرہ میں اپنا جائز مقام حاصل کرنے کا تقاضا کرے گی۔ یہ باوجودیکہ روایاتی طرز موجود ہو پھر بھی دباؤ اور نفرت کا ہی مظاہرہ کریں گے۔

موجودہ پرورش پائی ہوئی پود کا کیا ہو گا؟ کس پرچم اور کس نام کے تحت یہ جدّ و جہد شروع کریں گے؟ کیا یہ مغربی تمدّن سماج اور تہذیب کو اُکھیڑ پھینکیں گے اور ایک نئی تصوریت کو قائم کریں گے؟ یہ البتہ قابل قبول ہے کہ تمام یا کسی مذہب کے داعی اگر اسے اپنا مخلص مقصد بنالیں اور اس پر کام کریں کہ خدا سے اُٹھے ہوئے ایمان کو جرمنی کی اس پود میں زندہ کر دیں، تو وہ لاکھوں انسانوں کی اس کھیپ کو اس المناک ٹریجڈی سے بچالیں گے جو خود ان کے اندر سے پیدا ہو رہی ہے۔ وہ خودکشی اور اندھی تباہی سے بچ جائیں گے جو ان کے مستقبل اور مادرِ وطن کا ہولناک انتظار کر رہی ہے،،

ارنسٹ ولیم بارنز (ERNEST WILLIAM BARNES) بشپ آف برمنگھم کی علمی تحقیقات

"عیسائیت کا آغاز" (THE RISE OF CHRISTIANITY) کے عنوان سے چھپی ہے جس میں انہوں نے ابتدائی عیسائی مبلغین کی تبلیغی سرگرمیوں اناجیل کے متعدد نسخوں اور خود عیسائیت کے بنیادی تصورات پر کافی بحث کی ہے۔ ذیل کا ایک اقتباس مسیح کے ابن اللہ ہونے کے متعلق ہے:۔

> "اناجیل کا کلیدی تصور ہی مرقس کے افتتاحی جملہ میں سامنے آجاتا ہے اور وہ "یسوع مسیح کی اناجیل جو خدا کا بیٹا ہے" کے الفاظ ہیں۔ لیکن "خدا کا بیٹا" کے الفاظ بعض مستند قدیمی نسخوں میں موجود نہیں، اس لئے ہم یہ باور نہیں کر سکتے کہ اتنی اہم بات کسی بھول کی وجہ سے رہ گئی ہے۔ ہمیں اسے ماننا چاہیئے کہ یہ الفاظ اصل متن میں ہی موجود نہ تھے۔
>
> نہ صرف یہی بلکہ یہ تو اناجیل کے کلیدی تصور کی ہی نفی کر دیتے ہیں۔ کیونکہ یہ حاشیہ حقیقت میں نمایندہ روم کا ہے [illegible] اور اس اہم وقت کا ہے جب یسوع فوت ہوا ہم نے اسے یوں پڑھا ہے (۱۵: ۳۹)
>
> "اور جب صوبہ دار نے جو وہاں اس کی نگہبانی کے لئے کھڑا تھا دیکھا کہ اس نے اس طرح پکارا اور اپنی جان دیدی تو کہا، یقیناً یہ آدمی ہی خدا کا بیٹا تھا"

اصلی یونانی متن میں اس پیرا کے آخری الفاظ میں کوئی تخصیصی لفظ نہیں۔ بلکہ یوں لکھا ہے:- "یقیناً یہ آدمی خدا کا بیٹا تھا" اس لئے ایسی کوئی سند نہیں کہ یسوع کو جب یہ کہانی پہلی مرتبہ سنائی گئی، خدا کا اکلوتا اور واحد بیٹا تصور کیا جاتا تھا، ہوسکتا ہے کہ یہ خیال اسی طرح کا ہو جیسے اور انسانوں کو بھی آسمانی باپ کا فرزند سمجھا جاسکتا ہے۔ لوقا نے صوبہ دار کے الفاظ یوں دیئے ہیں (۲۳: ۴۷):-

> "یقیناً یہ ایک راستباز (یا شاید معصوم) انسان تھا"
>
> (عیسائیت کا آغاز صفحہ ۸۴)

رومن کیتھولک چرچ کے نزدیک تمام دیگر مذاہب غلط ہیں اور افاضہ آلہی میں صرف وہ اپنے آپ کو منتخب سمجھتا ہے۔ آج تک رومن کیتھولک چرچ کا رویہ عدم مصالحانہ رہا ہے۔ حروب صلیبیہ اور ہسپانوی تعزیرات جس کی یادگار ہیں۔ لیکن پچھلے سال سے ویٹیکن کے طرز عمل میں عجیب تبدیلی ہوئی ہے۔ شروع

شروع میں مشرقِ وسطیٰ کے واقعات میں پوپ نے دلچسپی لی اور فلسطین کی مقدس زیارت گاہوں کے لئے تشویش ظاہر کی۔ پھر فلسطین کے ایک جائز حل کے لئے خود دُعا کی اور دیگر اُسقفوں کو دُعا کے لئے کہا۔ اب حال ہی میں وٹیکن اسٹیٹ ڈی پارٹمنٹ کے ایک گشتی مراسلہ میں اسلام کے مقام کا ذکر کیا ہے :-

"اسلام گو یہ ظاہراً معماتی ہو لیکن ہے یہی کہ ہمیں اپنی اہمیت کے بیجا وسیع زعم اور خداوند کے فیض کے متعلق ناروا تنگ ظرفی سے نجات حاصل کرنے میں مدد دے گا۔

متعدد پارس مسلمان مغربی دُنیا کے بیشمار مفکروں کی نسبت اُس خطرہ کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں جو کمیونزم سے مذہب کو درپیش ہے، اس وجہ سے ایک متحدہ دفاعی محاذ کی تشکیل غیر ممکن نہیں"

اسلام کی چودہ سو سالہ زندگی میں یہ شاید پہلا موقع ہے کہ رومن کیتھولک چرچ نے اسلام کے متعلق اپنے بند دروازوں کو کھولنے کا خیال کیا ہے۔ گو اسلام ابتدا سے ہی توحید خداوندی پر تمام انسانوں کو یکجا ہونے کی دعوت دیتا رہا ہے۔ لیکن اس کے برعکس رومن کیتھولک چرچ نے ہمیشہ اسلام سے نفرت کا پرچار کیا اور پروٹسٹنٹ چرچ کے بانی لوتھر کو "محمدی کُتا" (MOHAMMADAN-DOG) کہا۔ مغرب میں اسلام کی دعوت کو روکنے میں رومن کیتھولک چرچ کا بہت دخل ہے۔ مگر یہ نیا رجحان یقیناً ایک نیک فال ہے اور اس امر کی دلیل کہ مغرب میں عیسائیت، مادیت کی یلغار روکنے میں قطعاً ناکام رہی ہے۔

"میرے خدا نے زمین کو میرے لئے سکیڑ دیا یہاں تک کہ میں نے اس کے مشرقی ممالک اور مغربی زمینیں دیکھیں۔
اور مجھے بتایا گیا کہ میرے پیروؤں کا پھیلاؤ اِن سب دیسوں تک ہوگا"

محمد رسول صلعم

ایس محمد آصف (بی اے)

جدلی مادیت کا تاریخی پس منظر

ہر تہذیب و ثقافت کی بنیاد کسی اندازِ فکر اور بنیادی تصور پر ہوتی ہے اور اس ثقافتی دائرہ میں بسنے والے انسانوں کی زندگی کے تمام پہلو اس بنیادی تصور سے متاثر ہوتے ہیں ۔ مثلاً ہندو کلچر کا بنیادی تصور ورن سسٹم اور کرم فلاسفی ہے جو ہندو ازم کے تمام فرقوں میں بطور قدر مشترک کے ہے ۔ اس خوفناک اور غیر انسانی تصور نے جو بے لچک ثقافتی دائرہ پیدا کیا اسے سب سے پہلے بدھ مت نے چیلنج کیا اور بعد میں اسلام کی حرکی اور ثقافتی قوت نے توڑا ۔ ایرانی تہذیب کا بنیادی تصور مجوسیت ہے جو ایک قسم کی روحانی ثنویت ہے ۔ یعنی اس کائنات میں نور اور تاریکی دو بنیادی قوتیں ہیں جو انسانی سطح پر آکر نیکی اور بدی میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتی ہیں ۔

اسلام بھی ایک روحانی، اخلاقی اور ثقافتی قوت ہے جس نے نسل انسانی کی تاریخ کو سب اصلاحی اور انقلابی تحریکات سے بڑھ کر متاثر کیا ہے ۔ اسلام کا بنیادی تصور خدا کی وحدت پر ایمان، ہیئت اجتماعیہ انسانیہ پر محکم یقین اور انسانی فطرت کی لازوال روحانی اخلاقی اور عملی قدروں پر اعتبار ہے ۔ اسلامی ثقافت کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ دنیائے قدیم اور دنیائے جدید کے تمام صالح عناصر کو اپنے اندر سمیٹ کر اور ان میں ایک توازن قائم کر کے سب انسانوں کے لئے مساوی طور پر انفرادی اور اجتماعی رنگ میں آزادی، ترقی اور نشو و نما کے راستے کھول دیتی ہے ۔ اس میانہ روی، توازن اور انسان دوستی ... کے باعث امت محمدیہ کو امت وسطاً اور دین اسلام کو دین فطرت کہا گیا ہے ۔

عصر حاضر میں دین فطرت کا مدمقابل مغربی تہذیب کا بنیادی تصور یعنی مادیت ہے یا اس کی انتہائی شکل جدلیاتی مادیت ہے جس پر کمیونزم کی عمارت کھڑی ہے ۔ یہ مادیت اور اس کی انتہائی شکل جدلیاتی مادیت کیا ہے ۔ اس کو سمجھنے کے لئے مغربی تہذیب کے مختصر سے پس منظر کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے ۔ اس پس منظر اور تاریخی ماحول پر غور کئے بغیر مغربی تہذیب کے اس مرکزی نقطہ کو سمجھنا آسان کام نہیں ۔

اس تاریخی ماحول کی ابتداء یورپ کی تحریک احیائے علوم سے ہوتی ہے۔ اور یہ تحریک احیائے علوم نتیجہ ہے حروب صلیبیہ کا۔ یہ وہ خونین جنگیں ہیں جنہوں نے ۱۰۹۵ء سے ۱۲۰۴ء تک اسلامی دنیا اور عیسائی دنیا کو ایک خونین آویزش میں اُلجھائے رکھا۔ ان جنگوں میں جہاں وسیع پیمانہ پر ..... انسانوں کا قتل عام ہوا وہاں ان کا ایک فائدہ بھی ہوا۔ مسلمانوں سے نبرد آزما ہونے کے طفیل یورپ میں احیائے علوم اور احیائے مذہب کی تحریکات شروع ہوئیں جنہوں نے لاطینی عیسائیت جس کی بنیاد یونانی، رومی اور مصری اساطیر و خرافات پر تھی کے اقتدار کو ختم کر کے سائنس، علم، فن، سیاست اور معیشت کے نئے راستے کھولے اور یورپ میں ایک فطری قانون کے مطابق اشیاء عالم کو مرتب کرنے کے لئے ماحول کو سازگار بنایا اور انہیں علوم نے ریفرمیشن کی صورت .... میں پاپائیت کے ناگوار تحکم کو ختم کیا۔ اس مذہبی تحریک سے شمال مغربی یورپ کا ایک بہت بڑا حصہ کٹ کر رومی کلیسا سے علیحدہ ہوگیا۔

اس تغیر عظیم کا ردّ عمل رومی کلیسا میں ہوا اور اس ردّ عمل کی سب سے بڑی شخصیت ایک ہسپانوی سپاہی تھا جس کا نام (ST-IGnatias-of Loyala) ہے۔ ۱۵۲۸ء میں اس سپاہی نے ایک مجلس کی بنیاد رکھی جسے "مجلس یسوع" یا جیسوئٹس بھی کہتے ہیں۔ یہ عیسائی دنیا کی سب سے بڑی علمی اور تبلیغی مجلس ہے اس مجلس نے ہندوستان، چین، امریکہ اور افریقہ میں عیسائیت کو پھیلایا اور اس مجلس نے رومی کلیسا کے متبعین کے ذہنوں میں بیداری اور روشنی پیدا کی۔

اطالیہ میں احیائے علوم، جرمنی میں احیائے مذہب اور لاطینی عیسائیت کے دائرہ میں علمی اور تبلیغی تحریک نے سارے یورپ کو کچھ کے دے کو بیدار کیا۔ جس کے نتیجہ میں سترھویں صدی عیسوی کے آخری ربع میں اجتماعیات اور سیاسیات پر اتنا لٹریچر پیدا ہوچکا تھا کہ اسے محسوس کیا جاسکے۔ اذہان میں اجتماعی مسائل کے متعلق تجسس اور تحقیق کا مادہ پیدا ہوگیا تھا۔ دانتے، مکیاولی، مانٹسکیو اور جان لاک اس سیاسی بیداری کے پیش رو ہیں۔ سینٹ آگسٹائن کے بعد دانتے اور مکیاولی قرن وسطیٰ کے رجال ہیں مانٹسکیو اور جان لاک کے مقالات میں نئے سیاسی دور کی انقلابی دھمک ہے۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں اس سیاسی حقوق اور بیداری کی تحریک کے رجحانات واشگاف ہوجاتے ہیں۔

مجلس یسوع سے متاثر ہونے والے بعض مفکرین تاریخ یورپ کے اس انقلابی رستہ کو اپنا کر ایک مثالی دنیا کا ڈھانچ تیار کرتے ہیں، یہ باغی ادیب اور مفکرین (ENCYLOPAEDISTS) کے نام سے مشہور ہیں۔ ان ادیبوں میں سے ڈائیڈیرو، روسو، والٹیئر، اور مولباخ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ موجودہ یورپ کے پہلے معمار ہیں۔ احیائے علوم کی تحریک کلیسائی عدالتوں کے مظالم کو برداشت کرتی ہوئی اور وحدۃ الوجو

اور مختلف کائناتی تصورات کے سانچوں میں ڈھلتی ہوئی ان مفکرین کے ہاتھوں میں پہنچ کر ٹیکنیک، نیچریت مادیت ذہنی بغاوت اور سیاسی انقلاب کا روپ دھار لیتی ہے یعنی علم اور سائنس کے ڈانڈے اجتماع اور سیاست سے جا ملتے ہیں۔

قرون وسطیٰ کی ملوکیت، کلیسا اور نظام جاگیرداری کے سب ادارے تنقید کی زد میں آجاتے ہیں۔ روسو جو اس دور کا سب سے بڑا انقلابی مفکر ہے ذہنی بیداری کی حد سے گذر کر اس دور کے نظام حکومت سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ اس کے خیالات یورپ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتے ہیں اور فرانسیسی ملوکیت کو جھلس کر رکھ دیتے ہیں۔ فرانس میں سیاسی انقلاب آجاتا ہے ملوکیت کی جگہ ریپبلک قائم ہو جاتی ہے۔ فرانس کا انقلابی نعرہ اور انقلابی ترانہ مغربی دنیا کو بنیادوں سے ہلا دیتا ہے۔

انقلاب فرانس یورپ کی سیاسی، اجتماعی اور علمی تاریخ کے بنیادی تصورات میں تغیر عظیم کا آئینہ دار ہے۔ انقلاب فرانس کے بعد علم اور سائنس کی قوتیں کلیسا اور ملوکیت کے چنگل اور استبداد سے آزاد ہو جاتی ہیں اور مشینوں کی ایجادات کے لئے راستہ صاف ہو جاتا ہے جس سے فیوڈل ازم کا جامد نظام تہ و بالا ہو جاتا ہے۔ زراعت کی جگہ صنعت و حرفت لے لیتی ہے۔ پیداوار کے مراکز بجائے وسیع کھیتوں کے بڑے صنعتی شہر بن جاتے ہیں۔ نظام پیداوار بدل جاتا ہے جسے صنعتی انقلاب کہتے ہیں۔ اس مشینی نظام پیداوار کو نظام سرمایہ داری کہتے ہیں۔ فیوڈل ازم کے بڑے بڑے جاگیرداروں کی بجائے بڑے بڑے سرمایہ دار برسر اقتدار آجاتے ہیں اس نظام کا بنیادی پتھر مظلوم اور سستے مزدور بنتے ہیں اور سامراج کی بڑی منڈیاں تاخت و تاراج کے میدان بن جاتی ہیں۔

ماحول بالکل بدل جاتا ہے سیاست اور معاشیات کے مسائل بدل جاتے ہیں۔ طبقاتی نزاع، ذاتی ملکیت اور قدر زائد کے شعور سے تاریخ اور اجتماع کا ایک نیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اس تصور کا بانی کارل مارکس اور اس کے متبعین کمیونسٹ ہیں اور روسی انقلاب کمیونسٹ انقلاب ہے۔ نظام سرمایہ داری کی بنیاد عقلی مادیت پر تھی اور اشتراکی نظام کی بنیاد جدلیاتی مادیت ہے۔ یورپ کی وہ متحارب ذہنی رو جو حروب صلیبیہ سے شروع ہوئی وہ انقلاب فرانس اور صنعتی انقلاب کو عبور کرتی ہوئی جرمن فلسفہ، فرانسیسی سوشلزم اور انگریزی معاشیات کے امتزاج سے سائنٹیفک اور جدلی مادیت میں بدل گئی۔ جدلی مادیت عقلی مادیت کی ہی ایک نئی تفسیر ہے۔ اس تاریخی تسلسل اور پس منظر کے مختصر بیان کے بعد جدلیاتی مادیت کے اجزائے ترکیبی، مزاج اور اسلام کے روحانی نظام سے جزوی اور بنیادی اختلافات زیر بحث آجاتے ہیں۔

اٹھارویں صدی کے آخری ربعہ سے لیکر انیسویں صدی کے نصف تک انقلاب فرانس لموئی اس کے

بعد صنعتی انقلاب کے نتائج بالکل واضح ہو جاتے ہیں اور یورپ کے مذہبی اور سائنسی دھاروں کا تضاد نمایاں ہو جاتا ہے۔ انقلاب فرانس کے بعد ہیگل وہ سب سے پہلا مفکر ہے جس نے اس تضاد کو ایک نظام میں سمونے کی کوشش کی اس نے ایک فلسفیانہ نظام سیاست مرتب کیا جس میں سیاست کی حیثیت ثانوی اور یورپ کے مذہبی ورثہ اور مابعد طبیعات کو مقدم کیا گیا۔ اس تضاد کی جھلک روسو کی تصانیف میں بھی نمایاں طور پر موجود ہے لیکن ہیگل نے اس احساس کو باقاعدہ ایک نظامِ فکر کی شکل دی ہیگل کا فلسفہ مذہب اور سائنس کے تضاد میں سے پیدا ہوا اس لئے یہ مغربی تہذیب کے ایک خاص تاریخی ماحول کی پیداوار ہے۔ یہ تضاد اتنا بڑا تھا کہ بغیر منطق کے اس تضاد کو سمیٹنا بہت مشکل تھا۔ ہیگل نے اس کام کے لئے جس منطقی اسلوب کو استعمال کیا وہ اس تضاد سے خاص مطابقت رکھتا ہے۔ اس منطقی اسلوب کو اردو میں جدلیات اور انگریزی میں (DIALECTICS) کہتے ہیں۔

ہیگل نے یہ منطق یونانِ قدیم کے اساتذہ سقراط اور افلاطون سے مستعار لی۔ اس کا خیال ہے کہ مکالماتِ افلاطون اور سقراط کی طنزیات میں اس منطقی اسلوب کو اختیار کیا گیا ہے۔ ان دونوں میں استدلال کے رشتے یوں چلتے ہیں۔ ایک مسئلہ کے متعلق ایک خیال پیش کیا جاتا ہے۔ ایک شخص اس خیال کا اثبات کرتا ہے مکمل صداقت اس کے ساتھ ہے اور جو نفی کرتا ہے اس کا استدلال صداقت سے معرا ہے۔ لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو اثبات اور نفی دونوں میں صداقت جزوی طور پر موجود ہوتی ہے۔ مکمل صداقت دونوں میں نہیں ہوتی بلکہ ان دونوں کو ملانے سے اصلی نتیجہ پیدا ہوتا ہے اور اس طرح اضافی طور پر ایک صداقت کے بعد دوسری صداقت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔

ہیگل نے اس منطقی اسلوب کو جو صرف فلسفیانہ بحث و مناظرہ تک محدود تھا۔ یورپ کی تاریخ پر چسپاں کیا اور اس منطقی اضداد سے مغربی تہذیب کے دو متضاد پہلوؤں میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی اور انہیں ایک فلسفیانہ نظام میں ترتیب دیا۔ ہیگل نے یورپ کی تاریخ کو تصورات کی آویزش کی تاریخ قرار دیا اور اس کی قوت متحرکہ رُوحِ مطلق یعنی خدا ہے جو اس جدلیاتی تاریخی عمل میں اپنی تکمیل ذات کر رہا ہے۔ ہیگل نے عیسائی مذہب اور سائنس و سیاست کی اضداد کو مسئلہ وحدت الوجود کا سہارا دیکر قائم رکھنے کی کوشش کی اور جرمن قومی ریاست کو رُوحِ مطلق کی مشیت کے اظہار کا سب سے بڑا ذریعہ قرار دیا۔

لیکن اس کوشش کے باوجود اس تضاد میں فکری اور عملی امتزاج نہ ہو سکا۔ اور اس کے نظام فکر کی یہ دو ضدیں ایک دوسرے سے کٹ کر علیحدہ ہو گئیں اور دو متحارب تحریکات کی صورت میں ظاہر ہوئیں (۱) فسطائیت یا نازی ازم جس کی بنیاد ہیگلین تصوریت اور جرمن ریاست کی عظمت پر ہے۔ اور (۲) مارکسزم جس کی بنیاد ہیگل کے فلسفۂ اضداد پر ہے۔ اس فلسفۂ اضداد یعنی منطقی اسلوب کا خلاصہ یہ ہے۔ تاریخ کے

ہر دور ایک خاص تصور بطور بنیاد کے ہوتا ہے بالآخر وہ تصور اپنے اندر سے ایک ضد پیدا کر دیتا ہے یہ ضد دوسرے دور کا بنیادی تصور بن جاتی ہے اور یہ سلسلہ یونہی جاری رہتا ہے۔

تصورات کی ان ضدوں کی پیکار اور تسلسل کا نام DIALECTICAL PROCESS ہے اس کا خیال تھا کہ اس تصوری پیکار کا اختتام جرمن قوم کے سیاسی تفوق میں ظاہر ہوگا اور یہ تفوق ساری دنیا کی تہذیب کے لئے مرکز کا کام دے گا۔ ہیگل کی تعلیمات کے تین نمایاں اجزا ہیں:۔

۱- ہر قسم کا طبعی عمل جدلیاتی ہے

۲- طبعی عمل حقیقت ہے

۳- اور حقیقت محض ایک تصور ہے

مارکس اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ ہر طبعی عمل جدلیاتی ہے اور یہ بھی مانتا ہے کہ حقیقت طبعی عمل ہے لیکن تیسرے جزو کو کہ حقیقت ایک تصور ہے مارکس تسلیم نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے بلکہ اس کا یہ دعویٰ ہے کہ اصل حقیقت مابعد طبیعاتی تصور نہیں بلکہ عمرانی اور مادی ہے۔ انسانی سوسائٹی طبعی، جدلیاتی اور مادی طریق سے حرکت کرتی ہے۔ روح مطلق اس کی قوت متحرکہ نہیں بلکہ معاشی اسباب اور ذرائع پیدا وار اصل قوت متحرکہ ہیں۔ اور اسی قوت متحرکہ سے معاشرے بنتے اور بگڑتے ہیں اور مذہب و ثقافت کی مختلف شکلیں پیدا ہوتی ہیں۔ تاریخی عمل کی ضدیں تصورات نہیں بلکہ طبقات ہیں جن کی آویزش سے تاریخ میں حرکت پیدا ہوتی ہے۔ اصل حقیقت اشیاء ہیں اشیاء کے تصورات نہیں بلکہ تصورات مادی اشیاء سے پیدا ہوتے ہیں انسانوں کے خیالات اور افکار مادی اور معاشی ماحول کے سانچے میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ اگر کوئی تصور اصل شئے سے جس کا وہ تصور ہے مطابقت نہیں رکھتا تو وہ غلط اور بے فائدہ ہے۔ انسانوں کو اس تصور کو بدلنا پڑے گا عقلمند انسان معاشی قوتوں کے رجحان کو سمجھتے اور ان کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ یعنی مارکس تاریخ کے جدلی عمل کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن اس عمل کو خالص مادی اور معاشی عمل سمجھتا ہے۔ اور اس جدلی عمل کو وہ انسانی معاشروں اور انسانی تعلقات پر یوں منطبق کرتا ہے:۔

"جب میں نے ہیگل کے فلسفۂ حقوق کا تنقیدی نظر غائر سے مطالعہ کیا تو میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ کسی ریاست کی تشکیل اور قانونی تعلقات کو اس کی ظاہری ہیئت سے مطالعہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ انسانی دماغ کے عام ارتقاء سے

ا- KRITIK DER POLITISCHEN OKONOMIE

اس کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے بلکہ اس مذکورہ تشکیل اور تعلقات کی جڑیں انسان کی مادی زندگی میں گڑی ہوئی ہیں جس کی کلیت کو ہیگل نے اٹھارویں صدی عیسوی کے انگریز اور فرانسیسی مصنفین کی مثال کو پیش نظر رکھتے ہوئے "مدنی سماج" کی تشریحی ساخت محل نظر تھی اس لئے بڑے غور کے بعد جس نتیجہ پر میں پہنچا وہ میری علمی تحقیق میں میرے لئے شمع راہ بنا رہا اور یہی وہ اصول ہے جس نے ہمیشہ میری رہنمائی کی ہے۔ اس اصول کا ملخص یوں ہے:-

انسانی سماج کی صنعتی پیداوار کے عمل میں انسانوں کے درمیان بعض رابطے ان کے ارادہ اور منشاء کے بغیر پیدا ہوجاتے ہیں یہ تعلقات پیداوار کی مادی طاقتوں کے ارتقائی پہلو کو نہایت قطعیت کے ساتھ پیش کرتے ہیں ان تعلقات کی کلیت سے سماج کا معاشی ڈھانچ بنتا ہے یہ وہ حقیقی بنیاد ہوتی ہے جس پر ایک قانونی اور سیاسی ڈھچر نشوونما حاصل کرتا ہے اور اسی سے سماجی شعور کی بعض قطعی شکلیں مطابقت رکھتی ہیں مادی زندگی کی پیداوار کا طریقہ سماجی سیاسی اور ذہنی زندگی کے عمل کو معین کرتا ہے۔ انسانوں کا شعور ان کی زندگی پر اثر انداز ہو کر اسے معین نہیں کرتا بلکہ اس کے برعکس ان کی سماجی زندگی ان کے شعور کو معین کرتی ہے عمرانی زندگی کے نشوونما کے ایک خاص مقام پر سماج کی بارآور طاقتوں کا پیداواری رابطوں سے تصادم ہوجاتا ہے اگر اس مفہوم کو قانونی اصطلاح میں ادا کیا جائے تو یوں کہنا چاہیئے کہ ان مذکورہ طاقتوں کی ٹکر ملکیت کے ان رابطوں سے ہوجاتی ہے جن کے اندر اب تک وہ طاقتیں متحرک رہی ہیں۔ یہ رابطے اس تصادم سے پہلے بارآور طاقتوں کے لئے نشوونما کا باعث بنتے ہیں۔ لیکن ایک خاص حالت پر پہنچکر یہ رابطے اپنی کایا پلٹ کر کے پیداوار کے لئے رکاوٹیں اور زنجیریں بن جاتے ہیں اس حالت سے اجتماعی انقلابات کا دور شروع ہوجاتا ہے۔ جب معاشی بنیاد میں تبدیلی آتی ہے تو لازمی طور پر سماج کا عظیم الشان ڈھانچ نہایت سرعت

کے ساتھ بدل جاتا ہے ایسے تغیر پر غور کرتے ہوئے ہمیں دو باتوں کو ایک دوسرے سے ممتاز کرنا چاہیئے۔ یعنی ایک تو پیداوار کے معاشی کوائف کے مادی تغیرات جن کا تجزیہ نیچرل سائنس کی مانند نہایت صحت کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ اور دوسرے قانونی، سیاسی، مذہبی، فلسفیانہ اور فنی شکلوں میں یا بالفاظ دیگر نظریاتی شکلوں میں جن کے دائروں کے اندر حرکت کرتے ہوئے لوگوں کو اس کشمکش کا احساس ہوتا ہے اور وہ اس آویزش کو ایک خاص نتیجہ تک پہنچاتے ہیں ——— جیسا کہ ایک فرد واحد کے متعلق رائے قائم کرتے ہوئے ہم اس کے اندازے سے بہت چھوٹا خیال کرتے ہیں جتنا کہ وہ اپنی دانست میں اپنے آپ کو سمجھتا ہے بعینہ اسی طرح ہم ایک انقلابی زمانہ کا اندازہ اس کے شعور کے لحاظ سے بہت تھوڑا کرتے ہیں کیونکہ ہمیں اس شعور کی اس طرح توجیہہ کرنی پڑتی ہے کہ وہ مادی زندگی کے اختلافات سے پیدا ہوا ہے۔ بار آور طاقتوں اور بار آور تعلقات کے درمیان جو آویزش ہے اس کی وضاحت بھی کرنا ہوتی ہے۔ سماجی ڈھانچے کی کوئی قسم اس وقت تک تباہ نہیں ہوتی جب تک کہ اس سماجی نظام کی تمام بار آور قوتیں PRODUCTIVE FORCES پوری طرح نشو ونما حاصل نہ کرلیں جس کی اس نظام میں گنجائش ہے۔ نئی اور پہلے سے بہتر بار آور قوتیں اس وقت تک نمودار نہیں ہوتیں جب تک کہ زندگی کے مادی حالات جو ان قوتوں کے نشو و نما کے لئے ضروری اور بطور لازمی شرط کے ہیں قدیم سماج کے رحم WOMB میں پختہ نہ ہو جائیں یہی وجہ ہے کہ نوع انسانی کبھی اس کام کے لئے آمادہ نہیں ہوتی جس کے کرنے کی اس میں قابلیت نہ پیدا ہوئی ہو۔ جب ہم اس معاملہ پر گہری نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے اور ہمیشہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سوسائٹی میں نئی مہم کی مانگ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب زندگی کی مادی طاقتیں اس مہم کو کامیابی کے ساتھ بروئے کار لانے

کے لیئے بالکل پختہ ہوجاتی ہیں یا کم ازکم پختہ ہونی شروع ہوتی ہیں چنانچہ ہم ایشیاء، یونان، یورپ کے اقطاعی نظام FEUDAL SYSTEM اور موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کے بارآور طریقوں کو سوسائٹی کے معاشی نشوونما میں ترقی پسند ادوار کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں، نظام سرمایہ داری کے بارآور تعلقات سماج کے بارآور عمل کی آخری مقاومانہ شکل ہے، یہ مقاومت انفرادی مقاومت سے مطابقت نہیں رکھتی بلکہ یہ وہ مخالفت ہے جو سماجی حالات کی حرکت اور آویزش سے ایک فرد کی زندگی میں پیدا ہوتی ہے۔ تاہم بارآور قوتیں جو بورژوا سماج کے جسم میں نشوونما حاصل کر رہی ہیں وہ اس مقاومت کے حل کے لئے مادی کوائف پیدا کردیں گی جس کے نتیجہ میں سوسائٹی کی یہ تشکیل انسانی سماج کے قدیم دور کو ختم کر دیگی"

ذرا غور سے کام لیا جائے تو صاف نظر آجاتا ہے کہ کارل مارکس جو کمیونزم کا بانی ہے نے ہیگل کے فلسفہ اضداد کی خامیاں نمایاں کردی ہیں اور ان کے چہرہ سے منافقت کا نقاب اُٹھا دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ مغربی سرمایہ داری کا موازنہ خالص مادی ہے اور عیسائی مذہبیت کا تصور اس کیساتھ نبھ نہیں سکتا اور واقعی ہمیں یہ حقیقت یورپ کی تاریخ میں جلی حروف سے لکھی ہوئی نظر آتی ہے کہ عیسائیت اپنی بنیادی کمزوریوں کے باعث تحریک احیائے علوم اور سائنسی سیاسی رجحانات کا ساتھ نہیں دے سکی اس لئے مغربی مفکرین کو عیسائی مذہب جس میں ترکِ دُنیا کی تعلیم تھی اس کی ایک حد یعنی مادیت کو مغربی تہذیب کا بنیادی تصور بنانا پڑا یا کلیسا کی مخالفت کے نتیجہ میں خود بخود یہ تصور پیدا ہوگیا اور یہ تصور مختلف مراحل میں سے گذرتا ہوا مارکسزم کی صورت میں اپنی پوری قوت سے ظاہر ہوا ہے۔ عیسائیت اپنے خرافاتی مزاج کے باعث جدید یورپ کے جدید سائنٹیفک تقاضوں کی حریف نہیں ہوسکی عیسائیت ناکام ہوکر ایک دوسرے حرکی مذہب کے لئے جگہ خالی کر گئی ہے۔ اس خلا کو صرف اسلام پورا کر سکتا ہے کیونکہ اسلام انسانی فطرت کے روحانی، اخلاقی اور ثقافتی تقاضوں کو پورا کرتا ہے اور اس کا مزاج سائنٹیفک بھی ہے۔ مارکسزم نے اس خلاء سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ لیکن جہاں تک انسانی فطرت کے بنیادی اور سرمدی تقاضوں کا تعلق ہے ان کو پورا کرنا اس کے بس کا روگ نہیں کیونکہ عیسائیت میں اگر محض ترکِ دُنیا کی تعلیم تھی تو اس میں محض دُنیا پرستی ہے جو لوگ عیسائیت کے ایک بنیادی نقص کے باعث عیسائیت

سے نجات حاصل کر چکے ہیں وہ آسمان سے گر کر مارکسزم کی کھجور میں کیسے اٹک سکتے ہیں۔ اسلام نے یورپ کے استقرائی دماغ کو بیدار کیا اور اسے علم و سائنس کے جدید راستوں پر ڈالا اور وہ علم و سائنس سے پیدا شدہ مسائل کا حریف بھی ہو سکتا ہے۔ بریفولٹ اپنی تصنیف "تعمیرِ انسانیت" میں لکھتا ہے:-

"عربی تہذیب کی طرف سے سائنس موجودہ دُنیا میں ایک مہتم بالشان اضافہ ہے لیکن اس کے پھل بتدریج پک کر تیار ہوئے ہیں۔ مورش کلچر (اندلسی عربوں کی ثقافت) کے ناپید ہونے کے بہت عرصہ بعد سائنس کا وہ عفریت جس کو اس نے جنم دیا تھا اپنی بلوغت کو پہنچا۔ صرف سائنس سے ہی یورپ کے مردہ جسم میں زندگی پیدا نہیں ہوئی بلکہ مغربی زندگی میں اسلامی تہذیب کے بہت سے اثرات کارفرما ہیں اور مغربی تہذیب میں ابتدائی دمک توقیتاً اسلامی تہذیب نے ہی پیدا کی ہے"

"مغربی اقوام کی ترقی کا ایک پہلو بھی ایسا نہیں جس میں اسلامی ثقافت کا قطعی اثر دریافت نہ کیا جا سکے۔

دورِ جدید کی اس نمایاں قوت میں یہ سب سے زیادہ اصح ہے یہی وہ قوت ہے جو اس دور کی فتح اور کامرانی کا باعث ہے یعنی نیچرل سائنس اور سائنٹیفک سپرٹ" ص ۹

تاریخ انسانی پر قرآن مجید اور اسلام کا اتنا گہرا اثر پڑا ہے کہ اُسے کسی صورت میں فراموش نہیں کیا جا سکتا بیشک یونانیوں نے دنیا کو بہت کچھ دیا ان کے احسانات کو دُنیا بھول نہیں سکتی۔ ان کی عظمت اس بات میں ہے کہ انہوں نے کائناتی اور انسانی مسائل کو شروع کیا لیکن ان کا تصوّر کائنات جن پر ان کے فلسفیانہ نظامات قائم تھے جامد اور غیر متحرک تھا زندگی کے متعلق ان کا نقطہ نگاہ محض مثالی اور نظری تھا۔ لیکن اسلام نے نیچر اور انسان کے متعلق صرف ذہنی بیداری ہی پیدا نہیں کی بلکہ زندگی کا ایک متحرک اخلاقی اور رُوحانی ضابطہ بھی دیا ہے ــــــ مادیت کسی اعلیٰ انسانی ثقافت کی اساس نہیں بن سکتی۔ قرآن مجید میں دنیائے قدیم کے ثقافتی تجربات بیان کئے گئے ہیں اور مختلف اقوام کے عروج زوال کے کوائف پیش کر کے ان سے نتائج اخذ کئے گئے ہیں ان نتائج کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تہذیب جس کا بنیادی تصوّر اخلاق اور رُوحانیت سے معرّا ہو اس میں ایک عارضی چمک دمک تو پیدا ہو سکتی ہے لیکن اسے پائیداری نصیب نہیں ہوتی۔ قرار صرف اسی تہذیب کو حاصل ہو سکتا ہے جو مخلوقِ خدا

کے لئے نفع رساں ہو اور حقوق کی ادائیگی میں انصاف سے کام لیتی ہو اور اس کے مزاج میں اس روحانی اخلاق کی جھلک ہو جسے قرآنی اصطلاح میں تقوے کہتے ہیں۔ قرآن مجید تقوے کو عمرانیات اور قوموں کے نشوونما کی روح رواں قرار دیتا ہے اور ہر قوم کو اس سنگِ امتحاں پر پرکھتا ہے جو قوم اس جوہر سے محروم ہو جاتی وہ ادنیٰ خواہشات کی غلام بنکر اقتدار اور اثر و نفوذ سے محروم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایک نہایت خوبصورت تمثیل میں اس عمرانی کیفیت کو بیان فرمایا ہے:۔

افمن اسس بنیانه علی تقوی من الله ورضوان خیر أم من اسس بنیانه علی شفا جرف هار فانهار به فی النار جهنم ۔ (توبہ) تو کیا جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے تقوی پر رکھی اچھا ہے یا وہ جس نے اپنی عمارت کی بنیاد ایک کھوکھلے گرتے ہوئے کنارہ پر رکھی سو وہ اسکو جہنم کی آگ میں لے گرا ۔۔۔ یعنی جو قوم اپنی تہذیب اور تمدن کی بنیاد اخلاق اور روحانیت کی دائمی قدروں پر رکھتی ہے بہتر رہی ہے اور جو قوم اپنی تہذیب کی بنیاد مادیت اور قوت و اقتدار کی خود غرضانہ خواہشات پر رکھتی ہے اور مخلوق خدا کی گردنوں پر اپنی مادی قوت کے بل بوتے پر دائمی طور پر مسلط رہنے کی کوشش کرتی ہے وہ اپنا گھر صداقت کی محکم چٹان پر نہیں بناتی بلکہ ایک کھوکھلے کنارہ پر بناتی ہے جو اسے مسلسل جنگوں کے جہنم میں گرا دیتا ہے۔ جس سے وہ باوجود کوشش کے نہیں ابھر سکتا۔ آج مغربی اقوام کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ان پر یہ اصول پوری طرح منطبق ہوتا ہے انہوں نے اپنی تہذیب کی بنیاد مادیت کے کھوکھلے اور ناپائیدار اصولوں پر رکھی ہے جن کے پیروؤں نے باوجود علم و سائنس کے انہیں مسلسل جنگوں کے ایسے جہنم میں جھونک دیا ہے۔ جس سے نجات بظاہر ناممکن ہے۔ بغیر اسلام کے روحانی اصول کو اپنائے ہوئے یہ اقوام تباہی سے نہیں بچ سکتیں۔

قرآن مجید نے مشاہدہ قدرت قوموں کے عروج و زوال کے بنیادی اسباب کی طرف بار بار توجہ منعطف کروا کے کائنات اور انسان کے متعلق ایک حرکی اور ارتقائی تصور پیش کیا ہے جو موجودہ سائنس اور سائنٹیفک اذکار سے ہم آہنگ ہو کر انہیں تباہی سے بچا سکتا ہے۔

اسلام پر معلوماتی ادب

مفت حاصل کرنے کیلئے

احمدیہ انجمن اشاعت اسلام احمدیہ بلڈنگس برانڈرتھ روڈ لاہور سے خط و کتابت کریں۔

شیخ محمد طفیل ایم اے

اسلام کا نظریۂ شعر

شعراء کے متعلق قرآن مجید فرماتا ہے والشعراء یتبعھم الغاوٗن ۵ المترانھم فی کل وادٍ یھیمون (اور شاعران کی پیروی گمراہ کرتے ہیں کیا تو نہیں دیکھتا کہ وہ ہر وادی سرگرداں پھرتے ہیں (۲۶: ۲۲۴-۲۲۵)
اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آتا ہے وما علمنہ الشّعر وما ینبغی لہ (ہم نے اس کو شاعری نہیں سکھلائی اور نہ ہی یہ اسکی شایان شان تھی (یٰس ۶۹:۳۶)

سورۂ الشعراء کی ان آیات سے متصل دو آیات اور بھی ہیں جو اس مضمون کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہیں:- والشعراء یتبعھم الغاون ۵ المترانھم فی کل وادٍ یھیمون ۵ وانھم یقوٗلون مالا تفعلون ۵ اِلا الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت والذکر اللّٰہ کثیرا۔
(الشّعراء ۲۲۴-۲۲۷)

اور شاعران کی پیروی گمراہ کرتے ہیں کیا تو نہیں جانتا کہ وہ ہر وادی میں سرگرداں پھرتے ہیں۔ اور اُن کے قولؓ فعل میں ہم آہنگی نہیں ہوتی سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لاتے ہیں اور اعمالِ صالحہ کرتے ہیں اور اللہ کا بہت ذکر کرتے ہیں۔

ان آیات میں ایک طرف شعراء کے متبعین کی خصوصیت بتائی ہے کہ گمراہ لوگ ہی ان کی پیروی کرتے ہیں جنہیں نیکی اور راستبازی سے دُور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا اور دوسری طرف ان شعراء کی حالت کو بیان کیا ہے جن کی زندگی کا کوئی معیّن مقصد نہیں۔ وہ یونہی اِدھر اُدھر صحرا نوردی اور دشت پیمایاں کرتے پھرتے ہیں۔ شترِ بے مہار کی طرح جس طرف منہ اُٹھایا اسی طرف چل پڑے۔ کسی کی تعریف کرنے پر اُتر آئے تو زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ مذمت شروع کی تو تمام اعمالِ قبیحہ اس کی طرف منسوب کر دیئے۔ مبالغہ اور جھوٹ کی آمیزش ہی اُن کے کلام کا جزو اعظم ہے۔ اصمعی کا قول ہے کہ شعر میں جس قدر جھوٹ اور مبالغہ زیادہ ہوتا ہے شعر اچھا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حسانؓ جاہلیت میں نامور شاعر تھے۔ مگر اسلام لانے کے بعد ان کی شاعری گر گئی تھی تو حضرت حسانؓ

سے دریافت کیا گیا کہ اسلام کے بعد آپ کی شاعری میں وہ بات نہیں رہی۔ تو فرمایا اسلام جھوٹ بولنے سے منع کرتا ہے اور شعر کی خوبی اسی میں ہے۔" (ادب العرب صہ ۱۳۲)

ایسے شعراء اپنے جذبات اور احساسات کے اظہار کے لئے تصنّع اور تکلّف کے بغیر کوئی راہ نہیں پاتے اسلوب بیان میں خلوص کا نام و نشان نہیں ہوتا۔ یہ پہلی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے جو ایک شاعر میں اور ایک ملہور الٰہی میں ہوتی ہے اور ایسے ہی شعراء کا ذکر قرآن مجید نے مذکورہ بالا آیات میں فرمایا ہے۔

دوسری خصوصیت جس کی طرف قرآن شریف ہماری توجہ مبذول کراتا ہے وہ یہ ہے کہ ایسے شعراء کے قول و فعل اور قلب و زبان میں ہم آہنگی نہیں ہوتی (یقولون مالا تفعلون) انہیں اس بات سے کیا تعلق کہ جو کہتے ہیں اس پر عمل پیرا ہو کر بھی دکھائیں ان کے پیش نظر تو محض گرمئ سخن اور زوقِ بزم ہوتی ہے۔

اگر یہ باتیں کسی شاعر کے کلام میں پائی جائیں تو بے شک ایسے شخص کا کلام قابل قبول نہیں اور آنحضرت صلعم نے بھی ایسی شاعری کو کبھی پسند نہیں فرمایا۔ لیکن اگر کسی شاعر کے کلام کا سرچشمہ خود قرآن مجید ہو اسکی منزل خود قرآن مجید کی متعین کردہ منزل ہو، وہ سوچتا ہو تو قرآن پاک کی مدد سے، دیکھتا ہو تو اسی نور سے تو وہ شعراء کے اس زمرہ سے باہر ہے۔

قرآن مجید نے اگلی آیت میں خود ایسے لوگوں کو مستثنیٰ قرار دیا ہے:۔ الا الذین آمنوا وعملوا الصّٰلحٰت وذکروا اللہ کثیرا اسی قسم کی شاعری کے متعلق علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

شعر را مقصود اگر آدم گری است ٭ شاعری ہم وارثِ پیغمبری است

اس سے معلوم ہوا کہ مومن اگر کسی امر حق کا اظہار اشعار میں کرتا ہے تو وہ ایسے شعراء کے زمرہ سے باہر ہے جن کا قبلۂ مقصود متعین نہیں، جن کے گفتار اور کردار میں ہم آہنگی نہیں۔

قرآن کریم میں یہ جو آتا ہے وَمَا علّمنٰہ الشعر وما ینبغی لہ۔ ان ھو الا ذکرٌ و قرآنٌ مبینٌ لینذر من کان حیا و یحق القول علی الکافرین (یٰسین ۶۹، ۷۰)

اور ہم نے اسے شعر نہیں سکھایا اور نہ اسے یہ شایاں ہے یہ صرف نصیحت اور قرآن مبین ہے تاکہ اسے ڈرائے جو زندہ ہے اور کافروں پر بات سچ ثابت ہو۔

ان آیات کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل امور کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے:۔

(۱) قدیم عرب کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جو شخص معمولی آدمیوں سے بڑھ کر موثر اور دلکش تقریر کرے وہ شاعر ہے۔ (مقدمہ دیوان حالی)

یا جیسا کہ نکلسن نے "لٹریری ہسٹری آف دی عربز" صہ ۷۲ پر لکھا ہے کہ:۔

" قدیم عرب لوگ شاعر کو جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ایک

مافوق الفطرت علم کا مالک سمجھتے تھے، ایک ایسا جادوگر
جس کی رُوحوں سے یا شیطان سے ساز باز ہو، اور وہ اپنی
ساحرانہ قوتوں کے اظہار کے لئے ان پر بھروسہ رکھتے"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کفار کا خیال تھا کہ رسول اللہ صلعم بھی اسی قسم کے لوگوں میں سے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اس بات کی تردید کی ہے۔ قرآن کریم میں دوسرے مقامات پر اس امر کی زیادہ وضاحت کی ہے کہ:- وما ھو بقول شاعر قلیلا ما تؤمنون ۝ ولا بقول کاھن - اور شاعر کی بات نہیں۔ کیا ہی کم تم ایمان لاتے ہو اور نہ کاہن کی بات ہے۔

۲- شعر انسانی متخیلہ کی تخلیق ہوتا ہے۔ لیکن الہام الٰہی تو ایک خارجی شئے ہے نہ یہ ذوقی احساس ہے نہ دل کی آواز جو دل ہی سے اُٹھتی ہے اور دل پر پڑتی ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے اس امر کی بھی نفی کی ہے کہ قرآن مجید کا پیغام کسی شاعر کے کلام کی حیثیت نہیں رکھتا اور نہ ہی یہ انسانی ذہن کی تخلیق ہے (تنزیلٌ من ربّ العلمین جہانوں کے رب کی طرف سے اُتارا گیا ہے۔ الحاقہ ع۲)

۳- ان آیات کو اگر قرآن مجید کے دوسرے مقامات کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے شعر و شاعری کے متعلق ایک نظریہ خود بیان کیا ہے۔ اس نظریہ کی خصوصیات کا ذکر سورۂ شعراء میں ہے کہ شعراء کے متبع گمراہ لوگ ہوتے ہیں، شعراء خود تخیل کی ہر وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور جو وہ کہتے ہیں کرتے نہیں۔ ان پر بحث اوپر گذر چکی ہے۔ اگر کفار کا یہ خیال تھا کہ رسول اللہ صلعم اور ان کے پیرو نعوذ باللہ ان خصوصیات کے حامل تھے تو یہ بالبداہت باطل ہے۔

۴- اگر یہ کہا جائے کہ فصاحت و بلاغت، لطافت و رنگینی جو کسی کلام منظوم میں پائی جاتی ہے اس سے قرآن مجید معرا ہے تو یہ درست نہ ہوگا۔ بلکہ فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے قرآن مجید میں شعریت کا مزہ حُسن موجود ہے جو ایک اعلیٰ قسم کی شاعری میں پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود قرآن کریم شعر نہیں اور رسول کریم صلعم کو ہم شاعر نہیں کہہ سکتے کیونکہ قرآن مجید تو ایک حکمت کی کتاب ہے جیسا کہ سورۂ یٰسین کی ابتدا میں آتا ہے والقرآن الحکیم یعنی اس میں اعلیٰ درجہ کے علمی اُصول بیان کئے گئے ہیں شاعر کی طرح صرف تخیلات کے حسین و جمیل مناظر یا تصورات کے بھیانک نظارے جن پر نام نہاد شاعری کا دارومدار ہے۔ سامنے لانا قرآن مجید کا مقصد نہیں اور نہ ہی رسول اللہ صلعم اس امر کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ قرآن تو لوگوں کے لئے بیان، ہدایت، وعظ، بصیرت اور رحمت ہے۔ ھٰذا بیانٌ للناس وھدًی وموعظۃ للمتقین (آل عمران) ھٰذا بصائر للناس وھدًی

ورحمۃ (الجاثیہ)

ان آیات میں اس طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ قرآن مجید ذکر ہے جو فطرت کی کھوئی ہوئی باتوں کی یاد دلاتا ہے (ان ھو الا ذکر) یہ مبین ہے (وقرآن مبین) جو ہر ضروری باتوں کو واضح طریق پہ بیان کرتا ہے اور وہ ایک خاص مقصد کے ماتحت ان لوگوں کو جو عقل سے کام لیتے ہیں اور مردہ دل اور کند ذہن نہیں ان کو کفر اور سرکشی کے انجام سے ڈراتا ہے (لینذر من کان حیا) اور کہ یہ محض دور از حقیقت باتیں بیان نہیں کرتا جن کا ظہور کبھی واقعات کی دنیا میں نہ ہو بلکہ اس کی باتیں ویسی ہیں جو قطعی سچ ہو کر رہنے والی ہیں (ویحق القول علی الکافرین) مجموعی طور پر ان امور کا شعر و شاعری سے کوئی تعلق نہیں اس لحاظ سے بھی قرآن کریم کو شعر سمجھنا اور رسول کریم صلعم کو شاعر سمجھنا محض بے بنیاد ہے۔

۵- یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ کفار جو رسول اللہ صلعم کو شاعر یا مجنون کہتے تھے تو ان کا اس بات سے مطلب کیا تھا۔ کیا جس ملک میں شاعری کا اتنا عروج ہو وہاں کوئی اس حقیقت کو بھی نہ پا سکا کہ قرآن مجید اشعار کا مجموعہ نہیں بلکہ نثر کی کتاب ہے۔ کیا فصحاءِ عرب نظم کو نثر سے شناخت نہ کر سکتے تھے کہ انہوں نے بغیر سوچے سمجھے یہ اعتراض کر دیا کہ رسول اللہ صلعم شاعر ہیں۔ مفرداتِ امام راغب کا یہ حوالہ قابلِ غور ہے:۔

"وقوله حكاية من الكفار بل افتراه بل هو شاعر و
قوله شاعرا ومجنون لم يقصد واهذا المقصد
فيه رموه به ذالك انه ظاهر من الكلام انه ليس
على اساليب الشعر ولا يخفى ذالك على الاغتام فضلا
عن بلغا العرب وانما رموه بالكذب فان الشعر
يعتبر والشاعر الكاذب قيل احسن الشعر اكذبه۔
(مفردات ص۲۶۲ ص۲۶۳)

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ کفار آنحضرت صلعم کو شاعر اور مجنون کہتے تھے اس سے مراد ان کا کلام موزوں نہ تھا بلکہ جس بات کا آنحضرت صلعم پر اعتراض کیا جاتا تھا وہ اور تھی ورنہ قرآن کا نثر ہونا تو ایسی بات ہے کہ کلام سے خود ہی ظاہر ہے کہ وہ شعر کی طرز پر نہیں۔ اور یہ امر ایک ۔۔۔ عام آدمی پر بھی مخفی نہیں رہ سکتا چہ جائیکہ بلغاءِ عرب نثر اور نظم میں تمیز نہ کر سکتے ہوں پس اصل بات ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلعم پر جھوٹ بولنے کا حملہ کیا تھا۔ کیونکہ شعر سے مراد

جھوٹ لی جاتی ہے اور شاعر کے معنی "کاذب" عربی ضرب المثل ہے کہ
سب سے اچھا وہ شعر ہے جس میں سب سے زیادہ جھوٹ ہو"۔

قرآن مجید نے کفار کے اتہام کا خود ذکر فرمایا ہے وقال الذین کفروا ان ھذا الا افک افتراہ (الفرقان ع) اور جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ کچھ نہیں مگر جھوٹ ہے نیز ام یقولون افتراہ (ہود ع) کیا وہ کہتے ہیں کہ یہ افترا ہے۔

شعراء عرب اپنے خیالات کو جن کی بنیاد اکثر اوقات کذب محض پر ہوتی تھی تخیل کی دلفریبیوں اور رنگینیوں کی آمیزش کے ساتھ نہایت فصیح و بلیغ طریق پر پیش کرنے کے عادی تھے۔ مبالغہ اور غلو کے ساتھ ساتھ ہزل و استہزاء بھی شاعری میں داخل تھی اس قسم کی شاعری کی واقعی اسلام نے کبھی اجازت نہیں دی۔

اس بات کا سمجھنا بہت آسان ہے کہ قرآن مجید نے جو شعر کی مذمت کی ہے تو اس سے مراد محض کلام موزوں نہیں کیونکہ کلام مجید کی کئی آیات پر بھی کلام موزوں کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ جیسے جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان زھوقا۔ سورہ رحمان کو بھی اگر اس نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت اور منکشف ہو جائے گی رسول صلعم کی زبان سے بھی کئی مواقع پر کلام موزوں کا جاری ہونا ثابت ہے گو بغیر شعر کہنے کے قصد سے ایسے الفاظ زبان مبارک سے نکل آئے ہوں۔

اسی مضمون کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بخاری میں روایت بھی مروی ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الشعر بمنزلۃ الکلام حسنہ کحسن الکلام و قبیحہ کقبیح الکلام یعنی شعر بمنزلہ کلام کے ہے اچھا شعر اچھے کلام کی مانند ہے اور برا شعر برے کلام کی مانند۔

عائشہ سے مروی ہے۔ قال رسول اللہ الشعر کلام من کلام العرب جزل تتکلمو بہ فی نوادیھا و تسل بہ الضغائن بینھا۔ یعنی شعر کلام عرب کا ایک بہترین حصہ ہے جس کے ساتھ وہ اپنی مجلسوں میں تکلم کرتے ہیں اور جس کے ذریعے سے باہمی کینے دور ہوتے ہوتے۔ ایک اور مقام پر آپ فرماتے ہیں:۔ ان الشعر لحکمۃ"

مذکرہ بالا واقعات سے کم از کم اس بات پر تو روشنی پڑتی ہے کہ مطلق شعر گوئی عیب نہیں۔ اگر شعر میں کوئی برائی ہے تو مضمون کے لحاظ سے ہے اور یہی اسلام کا نظریۂ شعر ہے۔

مساوات

ایوب صابر (کوہاٹ)

کل تو مسجد میں کہہ رہے تھے آپ
"ہیں برابر امیر اور غریب
ایک رشتے میں منسلک ہیں سب
ایک زمرے میں سب ہی شامل ہیں
ان میں تفریق ہو نہیں سکتی
مومنو! خود رسولؐ اکرم نے
اپنی سب زندگی گزاری تھی
بھوک، افلاس، تنگ دستی میں
وہ مساوات کے پیامی تھے۔
اُن کی عظمت کا پاس ہے سب کو
ہم نے تقلید ان کی کرنی ہے
پاٹ کر اے گروہ اہلِ حق
امتیازات کی خلیجوں کو"

آج پھر یہ گریز کیسا ہے
اے منافق، ضمیر کُش رہبر
خود تو بیٹھے ہیں آپ صوفے پر
اور کُتا بھی پاس بیٹھا ہے
جیسے انسان سے یہ افضل ہو
اور انسان — یہ آپ کا نوکر
ایسے بیٹھا ہے ایک کونے میں
جیسے انسان نہ ہو یہ کُتا ہو۔

نومسلمہ

ط، ف، ی، ل

سرود و رقص کا جو لطف تھا وہ خواب ہوا
نئی حیات میں یہ کیسا انقلاب ہوا
درِ رسولؐ پہ قربان زندگی کر دے
یہ عزم راست روی تیرا کامیاب ہوا
عزیز تیرے ہیں ناراض تیری حالت سے
سہیلیاں تجھے تکتی ہیں کس حقارت سے
مگر نہیں ہے کسی طور یہ گوارا تجھے
کہ اک قدم بھی تو ہٹ جائے دینِ فطرت سے
وطن سے قوم سے تجھ کو عزیز تر اسلام
ترے لئے ہے نئی زیست کی خبر اسلام
تلاشِ راہِ صداقت میں تو نے پایا ہے
کہ زخم خوردہ دلوں کا ہے چارہ گر اسلام
رہے گا کیف و مسرت سے پُر شباب ترا
کہ دینِ خالقِ فطرت ہے انتخاب ترا
ملائکہ کے لئے بھی ہے لائقِ صد رشک
شراب و عیش کی دنیا سے اجتناب ترا
قبولِ دینِ محمدؐ تجھے مبارک ہو۔

محمد اعظم علوی

........پُوچھتا ہُوں

خلوص و محبت کا گھر پُوچھتا ہُوں ٭ کہاں ہیں وہ دیوار و در پُوچھتا ہُوں
وہ منزل ہم آغوش راہیں کہاں ہیں ٭ کہاں ہیں وہ شام و سحر پُوچھتا ہُوں
پکڑ کر ہر اک موجۂ زندگی کو ٭ کنارِ سکونِ جگر پُوچھتا ہُوں
وہ تبلیغِ دیں اور ایمانِ محکم ٭ کہاں ہیں کہاں ہم سفر پُوچھتا ہُوں
اُلجھتے رہے ہیں جو برق و شرر سے ٭ عنادل سے وہ بال و پر پُوچھتا ہُوں
جو منزل کی عظمت سمیٹے ہوئے تھے ٭ کدھر ہیں وہ چشم و نظر پُوچھتا ہُوں
علاجِ غمِ زندگی ہو رہا ہے ٭ علاجِ غمِ چارہ گر پُوچھتا ہُوں

فضائیں نئی کروٹیں لے رہی ہیں
ہے علوی تجھے کچھ خبر پُوچھتا ہُوں

"انسان"

پرولتاری

قدیم بھی ہے جدید بھی ہے
تجھے قدیم و جدید سے کیا
تجھے ہے انسانیت سے مطلب کہ ہے قدامت سے بغض و نفرت

جلا نہ پائے جو تیری ہستی
مصفّٰی تیرا چلن نہ ہوگر
تو خود سے بیگانہ رہ کے کیونکر
خود اپنی ہستی بنا سکے گا
وہ سوز و مستی دکھا سکے گا
جو دوسروں کے دُکھوں کو سمجھے
پرائے لوگوں کے کام آئے

بلند تر رومنوں کی عظمت
وہ دبدبہ گاتھ و ہنیوں کا
کنارِ دجلہ حسیں نشیمن
وہ نیل کے پُر جلال قبطی
مغنّی داؤد کا گھرانہ
کنارِ گنگا حسیں مَنادر میں گھنٹیوں کے جوان نغمے
بسیطِ صحرا میں صبحدم گونجتی ہوئی خوش نوا اذانیں۔
اُفق سے پھوٹے کئی سویرے
ہوائیں لاکھوں اُڑے پھریرے

قدیم سے ہی جدید میں ڈھل رہی ہیں عظمت کی داستانیں۔
جدید سے ہی قدیم میں زندگی کے آنچل اُلجھ رہے ہیں

کہانیاں یہ قدیم کی ہیں
کہانیاں یہ جدید بھی ہیں۔

تجھی سے ایوانِ رُوم میں مسکرائے عظمت کے شادیانے

تجھی سے عیسٰی کے ساتھیوں نے
گرا دیئے ٹائبر کے باسی
تجھی نے بدھ کو مقام بخشا
تجھی سے بابل نے اپنی دھرتی پہ گر کے آخر کو دیدیا دم
مصفّٰی تیرا چلن نہ ہوگر
جلا نہ پائے جو تیری ہستی
تو خود سے بے گانہ رہ کے کیونکر خود اپنی ہستی بنا سکیگا
تو عصرِ غائب۔ تو عصرِ حاضر
جو تو نہیں تو زمیں سے مطلب
تجھے جدید و قدیم سے کیا۔
تجھے ہے انسانیت سے مطلب
کہ ہے قدامت سے بغض و نفرت

تنقید و تبصرہ

کتابیں اور رسائل

نام:- REVIVAL OF ZAKAT

مصنف:- شیخ عطاء اللہ ایم اے آنرز پرنسپل ہیلی کالج آف کامرس لاہور

ناشر:- رین پرنٹنگ پریس لاہور۔ قیمت:- تین روپے۔ صفحات:- ۱۱۰

اسلام کے معاشی نظام میں زکوٰۃ کو کافی عمل دخل ہے اور سرمایہ کی ذاتی ملکیت کے باعث سماج میں جو اونچ نیچ ہو جاتی ہے اُسے مؤثر طریق پر دُور کرنے کے لئے زکوٰۃ کو بھی ایک حربہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

مسلمانوں کے دَورِ انحطاط کے بعد سے اب تک اسلام کی صورت کافی مسخ اور اُلجھ گئی ہے۔ خالص اسلام کو اس بہت بڑے اُلجھاؤ سے نکال کر نئے تقاضوں کے سامنے پیش کرنا آج ایک بہت دشوار کاوش ہے۔

زیر نظر کتاب اسی طرح کی ایک کوشش ہے۔ مصنف نے شروع سے آخر تک یہی کوشش کی ہے کہ وہ موجودہ زندگی کے زیادہ قریب ہو۔ معاشیات کا طالبعلم ہونے کے باعث مالیات کی اُلجھنوں سے بھی وہ خوب شناسا ہے۔ اسی طرح وہ زکوٰۃ کو مالیات کی نئی تکنیک کے مطابق پرکھتا ہے۔ جہاں جہاں مختلف نظریے آن کر ٹکراتے ہیں وہاں مصنف نے کم و بیش تمام خیالات کو پیش کرتے ہوئے اپنی ذاتی رائے کو بھی درج کر دیا ہے۔

کتاب کے آٹھ ابواب ہیں۔ جن میں پہلے اور آخری دو ابواب میں مصنف نے اُصولی بحث کی ہے باقی حصے تمام تر زکوٰۃ کے ایسے تفصیلی تجزیے پر صرف کئے ہیں جو مختلف اشیاء سے متعلق ہیں۔ اس تفصیلی جائزے کو الگ رکھتے ہوئے معاشی نظام میں زکوٰۃ کے متعلق دو اہم سوال ہمارے سامنے آتے ہیں:-

اوّلاً کہ زکوٰۃ نفع پر واجب الادا ہے یا سالانہ اسٹاک پر

ثانیاً کہ زکوٰۃ کا وہ نصاب جو مختلف اشیا پر مقرر کیا گیا ہے موجودہ بڑھتے ہوئے تقاضوں کو پورا کر سکے گا یا نہیں۔

پہلے سوال کے متعلق مصنف نے دونوں نظریئے پیش کر دیئے ہیں۔ لیکن خود کوئی رائے نہیں دی۔ جہاں تک نصاب کا تعلق ہے۔ اُس نے تفصیلی نصاب پیش کئے ہیں۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ نصاب بدل بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ اسی طرح پیشگی زکوٰۃ کی ادائیگی کے متعلق اپنی رائے دیتے ہوئے مصنف نے فتاوے

عالمگیری کی ایک ایسی رائے سے اتفاق کیا ہے جس میں کئی سال پیشتر بھی یہ ادا کی جاسکتی ہے حالانکہ دیہار جائیداو پر وہ زکوٰۃ تسلیم نہیں کرتے البتہ اس کی برآمدگی پر حضرت عمر بن عبد العزیز رح کے حوالہ سے صرف ایک سال کی زکوٰۃ جائز سمجھی ہے پیشگی زکوٰۃ اس لئے بھی ناممکن ہے کہ مستقبل میں جائیداد کے امانہ کا کوئی قطعی اندازہ نہیں ہو سکتا جبکہ سودی کاروبار بھی مطلقاً ممنوع ہو۔

بہرکیف اس کے باوجود بھی یہ ایک احسن کوشش ہے۔ مصنف اس کتاب میں غیر شعوری طور پر ایک سمجھے ہوئے فقیہہ کا کام بھی کر رہا ہے اور اس کی اس سعی پر ہم مصنف کو تحسین ادا کرتے ہیں کیونکہ اس نے زمانۂ حال کے ایک اہم سوال کا جواب دینے کی جرأت کی ہے۔

نام :۔ اسلامی تعلیمات
مصنف :۔ میر ولایت علی
ناشر :۔ دی ڈومی نین بک کنسرن حیدر آباد دکن
صفحات :۔ ۲۳۷ - قیمت سوا چار روپے کلدار

"اسلامی تعلیمات" کے زیر عنوان میر ولایت علی صاحب کے متعدد مضامین کو جو وقتاً فوقتاً شائع ہوئے ہیں یکجا کر دیا گیا ہے۔ میر صاحب زیادہ تر خاکسار تحریک کے بانی عنایت اللہ خاں المشرقی کی کتاب "تذکرہ" کے خوشہ چین ہیں اور خود بھی خاکسار رہ چکے ہیں۔ اپنے بنیادی نکتۂ نظر کے متعلق انھوں نے دیباچہ میں لکھا ہے :۔

> " ابتداءِ عمر ہی سے یہ تڑپ تھی کہ جب خدا ایک ہے اور نوع انسان کی پیدائش، پرورش، رہائش وموت کے سب حالات یکساں ہیں تو مذہب کے مقدس نام پر جنگ زرگری کیوں ہے ؟
>
> قرآن مجید کے بغور مطالعہ نے یہ بات واضح کی کہ تمام انسان ایک ہی اُمّت ہیں اور مذہب کا کام تو اجتماعیت کے ذریعہ انسانی زندگی کو زیادہ سے زیادہ خوشحال بنانا ہے"

اس دیباچہ کے بعد یہی خیال تھا کہ میر صاحب اس نکتۂ نظر کے تحت محض ایک اُصولِ زندگی کی تشریح نہ کریں گے۔ بلکہ ہمہ گیر انسانیت کے تصوّر سے تمام دینی یا لادینی تحریکات کو جو صرف اچھے انسان پیدا

کرنے کی کوشش کریں انہیں ہی حق کہیں گے اسی لئے انہوں نے :-

"اسلام نسل اور نسبت کی اجارہ داری نہیں بلکہ انسانیت
میں ترقی کرنے والے افراد کا اسم صفت ہے"

اسلام کو اسم صفت قرار دیا۔ اور یہی تعبیر انہوں نے قرآن سے بھی تلاش کی ہے :-

"قرآن نے دنیا کے تمام مذاہب و ملل کے نیک انسانوں
کو مسلم و متقی کہا اور وحدتِ انسانی کے انتشار کو کفر و
شرک بتلایا۔"

اب ایک ایسی تشریح کا مطلب تو یہ ہوا کہ تمام انسان خواہ وہ کسی اعتقاد کے پیرو ہوں اگر اچھے انسان ہوں تو ضروری نہیں کہ وہ محمد رسول اللہ کی نبوت اور خدا تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کریں کیونکہ وہ اس کے بغیر بھی مسلمان ہیں۔ کیونکہ وہ تو مسلم و متقی پہلے ہی سے ہو گئے۔

مگر حیرت ہے کہ پھر تمام کتاب اُس اسلام کی تشریح ہے جو محمد رسول اللہ پر قرآن کی صورت میں نازل ہوا۔ یہ تضاد کیوں؟ کیا ایک ہندو، عیسائی، یہودی، یا لادین اپنے مسلک پر قائم رہتے ہوئے پاک و صاف نہیں ہو سکتا۔ اُسے محمد رسول اللہ کی دعوت کیوں دی جائے۔ اگر یہ کہیں کہ وہ محمد رسول اللہ پر ایمان لائے بغیر رہ نہیں سکتا تو یہ حقائق کا انکار کرنا ہوگا۔

جہاں تک تشریح اسلام کا تعلق ہے مسلمان کی حیثیت میں مصنف نے مسائل کو احسن طور پر واضح کیا ہے مسلمان قوم کی فکری و عملی لغزشوں کو کھول کھول کر بیان کیا ہے۔ اور انہیں اس سے خبردار بھی کیا ہے مختلف عنوانوں کے تحت انہوں نے اچھا مواد اکٹھا کیا ہے : وحدت فکر و عمل اور اجتماعیت کے تصور سے انہوں نے تمام مسائل کا مطالعہ کیا ہے۔ اس طور پر ایک اچھی کوشش ہے۔

---

۳۰ راپریل تک رعایت

ووکنگ مسلم مشن انگلستان کی اردو کتابیں آپ کو ۳۰ راپریل تک خاص رعایت پر مل سکیں گی
آپ اس رعایت سے فائدہ اُٹھائیں۔

خود کتابیں حاصل کریں اور غیر مسلم دوستوں تک پہنچائیں۔

ووکنگ مسلم مشن عزیز منزل برانڈرتھ روڈ لاہور

IF YOU

Want a paper which sheds the Light of Islam in the pristine Purity.

IF YOU

Want a paper which makes a right scientific approach to religions.

IF YOU

Want a paper which has put up a fearless fight against all that is false and effate and lifeless in the body politic of Islam.

READ THE "LIGHT"

The well known English Weekly of Lahore Pakistan which has held aloft the torch of Islam for the last 27 years without a break.

THE "LIGHT"

Has been in the forefront of the freedom struggle of PAKISTAN.

ANNUAL SUBSCRIPTION Rs. 5/- *OR* (SHILLING TEN).

Apply to:

MANAGER

THE "LIGHT"

Ahmadiyya Buildings,

LAHORE (Pakistan).

رسالہ "اسلامک ریویو" کا دورِ جدید

رسالہ "اسلامک ریویو" جنوری ۱۹۴۹ء سے انگلستان سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کے حجم میں چار گنا اضافہ کر دیا گیا ہے ——

خصوصیات:-

- اسلامک ریویو ایک صوری معیاری اسلامی رسالہ ہے۔
- اسلامک ریویو میں اسلامی دنیا کے جملہ مسائل پر مضامین شائع ہوتے ہیں۔
- اسلامک ریویو میں معاشی، سیاسی اور مذہبی عنوانات پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔
- اسلامک ریویو سیاسیات کے متعلق معلومات فراہم کرتا ہے۔
- اسلامک ریویو میں غیر فرقہ دارانہ اسلوب کو اختیار کیا جاتا ہے۔
- اسلامک ریویو اسلامی ممالک کا آپس میں رابطہ قائم کرتا ہے۔
- اسلامک ریویو میں ایسے مضامین شائع کئے جاتے ہیں، جو اخوتِ اسلامیہ کے جذبہ کو فروغ دیں۔

—— ہم دنیا کے مسلمان مصنفین اور مضمون نگاروں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس بلند مقصد میں ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ جملہ مضامین انگریزی، اردو، فرانسیسی، جرمن اور عربی زبان میں لکھے جانے چاہئیں۔ ہر مضمون دو ہزار سے تین ہزار الفاظ پر مشتمل ہونا چاہئے انگریزی فرانسیسی جرمن اور عربی مضامین ایڈیٹر اسلامک ریویو، انگلستان کو بھیجے جائیں۔ اردو مضامین سیکرٹری مسلم مشن ووکنگ، برانڈرتھ روڈ، لاہور کے پتہ پر بھیجے جائیں۔

روشن دماغ مسلمان جو اسلامی دنیا کے مسائل میں دلچسپی رکھتے ہیں وہ اسلامک ریویو کی خریداری قبول فرمائیں۔

سالانہ چندہ: تیرہ روپے آٹھ آنے

پتہ:-

سیکرٹری ووکنگ مشن، عزیز منزل، برانڈرتھ روڈ، لاہور